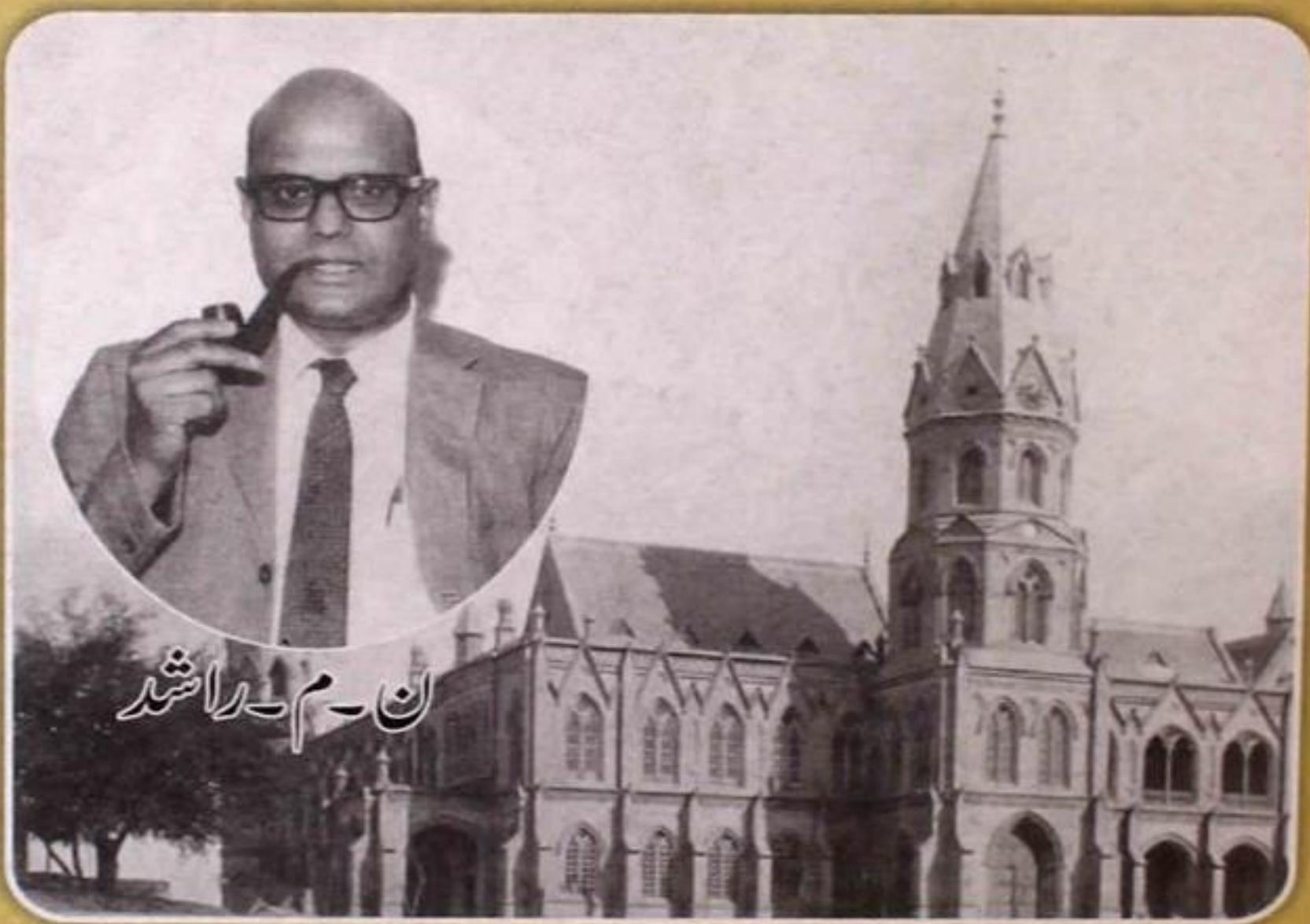


بسیار سالہ یوم پیدائش (۱۹۱۰ء - ۲۰۱۰ء)

انتساب تظہر راشد



پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

(بِسْمِ اللّٰہِ صَدَّقَہِ یوْمِ پیدائش ن۔ م۔ راشد)

انتخابِ نظم راشد

مرتبہ

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

شعبہ اردو

جی۔ سی یونیورسٹی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

عنوان کتاب	:	انتخاب نظم راشد
انتخاب	:	پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید
ناشر	:	شعبہ اردو جی ای یونیورسٹی، لاہور
تعداد اشاعت	:	۳۰۰
سن اشاعت	:	۲۰۱۰ء

فہرست

۵

جدلیاتی بہاؤ

ماورا

۱۰	ایک رات
۱۲	سپاہی
۱۳	زوال
۱۶	اطہار
۱۸	آنکھوں کے جال
۲۱	گناہ
۲۲	شاعر درماندہ
۲۳	شرایی
۲۵	خودگشی
۲۷	زنجیر
۲۹	خرابے

ایران میں اجنبی

۳۲	آواز
۳۳	دوری
۳۶	انقلابی
۳۸	ظلم رنگ
۳۹	ظلم ازل
۴۱	سایہ
۴۳	زندگی میری سہ نیم
۴۵	حرف ناگفتہ
۴۷	یہ دروازہ کیسے کھلا
۴۸	خلوت میں جلوت
۵۲	وزیرے چنیں
۵۵	شارخ آہو

ل=انسان

۵۹	مہمان
۶۲	ریگ دیروز
۶۳	بوئے آدمزاد
۶۵	آئندہ حس و خبر سے عاری
۶۷	زندگی اک پیرہ زن
۶۸	آرزو را ہبھے ہے
۷۰	آنکھیں کالے غم کی
۷۲	وہ حرفت نہا
۷۳	مسکراہیں
۷۵	مری مور جان
۷۷	تلسل کے صحرائیں
۸۰	رات خیالوں میں گم

گماں کا ممکن

۸۵	آگ کے پاس
۸۹	یہ خلاپر نہ ہوا
۹۱	بے سُر االاپ
۹۳	مریل گدھے
۹۷	یاراں سر پل
۱۰۳	رات شیطانی گئی
۱۰۵	کلام بنس نہیں رہا
۱۰۹	نیا آدمی
۱۱۱	زنجیل کے آدمی
۱۱۵	دوئی کی آبنا
۱۱۷	گماں کا ممکن
۱۲۳	حسن کو زہ گر

جد لیا تی بہاؤ

ن۔ م۔ راشد نے آزاد نظم کی تکنیک کے استعمال سے اردو شاعری کو بندگی سے نکال کر ایک ایسے راستے پر ڈالا ہے جس کی وسعتوں کا سراغ آئندہ زمانوں کے شاعر بھی دے سکیں گے۔ یوں اس کے فلکری اور فنی انجاماد کے معاملے بالائے طاق رکھے جا چکے ہیں۔ ”ماورا“ سے ”گماں کا ممکن“ تک کا سفر ایک پر احتیاط منصوبہ بندی سے طے کرنے کے بعد ن۔ م۔ راشد نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا کہ اب ان کے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے چاروں شعری مجموعوں میں اپنی شاعرانہ لمبیا جو ہر کو مکمل طور پر منتقل کر چکے ہیں۔ مزید برآں اس حقیقت سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے کہ زمانہ قیامت کی چال چلتا ہے اور اس کی تیز روی کے سامنے بڑے بڑے فلسف اور وقت سے آگے نکل جانے کی ڈینگیں مارنے والے دانشور کسی بھی طور پر ٹھہر نہیں سکتے۔ سورا شد صاحب نے اپنے فلکری اور جذباتی امکانات کی فنی حد بندیاں کرنے کے بعد اپنی تکرار محض سے کوئی نسبت نہیں رکھی اور اس پر ان کے ایک مدعا عظیم نے اپنی نئی شاعری کی لاج رکھنے کے لیے اعلان کر دیا کہ: ”ہر شاعر کا ایک عہد بہر حال ضرور ہوتا ہے اور وہ اسی کے حوالے سے زندہ رہتا ہے۔ اس کا شعری تجربہ اس عہد کی سچائیوں ہی سے طاقت حاصل کرتا رہتا ہے۔ مگر یہ عہد زودیا بہ دریخت ضرور ہو جاتا ہے اور جوں ہی عہد بدلتا ہے شاعر کے لیے اس عہد کی سچائیاں بھی بدل جاتی ہیں۔ اب وہ نہ تو خود کو بدل سکتا ہے اور نہ ہی آنے والے عہد کو۔ لہذا اسے اپنے شعری سفر کا خاتمه نظر آنے لگتا ہے اور راشد کہ نہایت حقیقت پسند شاعر تھے انہوں نے واقعتاً نوشته دیوار پر ڈھلیا تھا،“ لا = راشد، ڈاکٹر جسم کا شیری، نگارشات لاہور، ۱۹۹۲ء

اس تناظر میں نئے اردو ادب کی ایک تو ان آوازانیں ناگی نے ن۔ م۔ راشد کی دور آخوندی نظموں کو ”شعر کبیر“ کہہ کر انہیں لازوال داد دی اور اپنے پرانے خیالات پر جارحانہ نظر ثانی کی۔ نئی شاعری کی تحریک کی داغ بیل ڈالنے والے شاعر افتخار جالب نے بھی ن۔ م۔ راشد کی علمتی وسعتیں رکھنے والی شاعری کو تمثالي تلاز مہ کاری کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا اور اس سلسلے میں ان کی نظم ”سبا ویران“ پر تلاز ماتی حاکمہ آ رائی کی۔ راشد کی شاعری کے دیلے سے جہاں ان سے ماقبل

کے کئی شاعروں کی روایتی شاعری کے چراغ گل ہوئے وہاں ان کے کئی معاصر جدید شاعر بھی اپنی صفتیں پیش کرے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد جانتے تھے کہ ہر زمانہ اپنے خیالات و افکار اپنے ساتھ لاتا ہے یوں جدلیاتی اصولوں کے مطابق ہر موجودی چیز نے آئندہ زمانوں کی نئی چیزوں کے سامنے پرانا ہونا ہی ہوتا ہے۔ ن۔ م۔ راشد کی نظموں کو ”شعر کبیر“ کے زمرے میں رکھنے کے لیے ناگی صاحب کو سینٹ جان پرس کی شاعری کو نمونہ بنانا پڑا۔ یعنی اس شاعری کو انہوں نے پرس کی طویل نظموں ’ہوا میں‘ اور ’برفیں‘ وغیرہ کے پس منظر میں رکھا اور ریت کے حوالے سے لکھی گئی راشد کی نظم کو ان کا شاخانہ جانا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ہر دور کے حاس شاعروں نے اپنے دور کے سودوزیاں کے حوالوں کو اپنی شاعری میں مناسب جگہیں دی ہیں۔ اس لیے ن۔ م۔ راشد کی شاعری ہو یا ان کے مابعد کی اس فقرے سے باہر نہیں ہے کہ ”شاعری فرد کی ذات اور معاشرے میں جنم لیتی، نئی بصیرتوں اور نئے حقالق کوئی شکلوں اور شاہتوں“ میں پیش کرتی ہے۔ ن۔ م۔ راشد نے ایک باشور شاعر کی مانند خیالوں اور لفظوں کی کفایت شعاری سے کام لیا۔ اور یوں پر گوئی کا الزام اپنے سر لینے سے گریز کیا۔ اور اسی نسبت سے اپنے معاصر پر گوشہ شرار پر ”جدبات کا حاتم طائی“ ہونے کی پہبیتی کی۔ ن۔ م۔ راشد نے نئے شاعروں کے لسانی تجربوں اور تشكیلوں سے کوئی زیادہ سروکار نہیں رکھا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے روایتی لفظیات کو روایتی حوالوں سے استعمال کیا ہو۔ ان کی نظموں میں آنے والا ہر پر انالفاظ نئے خیالاتی کلوں میں ڈھلن کر اپنی معنوی ساختوں کو تبدیل کر لیتا ہے۔ اس حوالے سے اگر ہم او گذن اور آئی۔ اے چڑڑ کی کتاب ”معنی کے معنی“ کا مطالعہ کریں تو لفظوں کے رنگ ڈھنگ ایک طسم کدے کی صورت سامنے آئیں گے اور ہم کہہ اٹھیں گے کہ ”طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ“۔ ن۔ م۔ راشد نے لفظ و معنی اور فکر و جذبہ کی ہم آہنگی کو ہمیشہ سامنے رکھا اور یوں ایک سحر کارانہ بہاؤ ان کے شعری اسلوب یا بیانیے کا جزو لا ینفق بن گیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے فنی و فکری لوازم کو اپنے شعور کے تابع رکھا اور یوں تلازماً بہاؤ سے پیدا ہونے والی آٹو میشن سے خود کو محفوظ رکھا۔

با ایں ہمہ ن۔ م۔ راشد کے شعری مجموعوں کی موضوعاتی اور ساختیاتی تبدیلیاں ہماری توجہ اس امر کی جانب مبذول کرواتی ہیں کہ ان میں موجود نظمیں غیر معمولی حد تک داخلی اور خارجی

تغیرات کے حوالوں سے نئے ترکیبی کلوں میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ راشد کے بنائے ہوئے ”ترکیبی کل“، ان کے اپنے زمانے کی جدید ضروریات کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے کہ یہ کل آئندہ نسلوں کے لیے سدر اہ بن جائیں۔ ان نسلوں کو اپنے ترکیبی کل بنانے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا تھا: ”ردو نظم میں جدیدیت کے مطالعے سے ہم پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ جدیدیت کا تصور جدلیاتی حقیقت رکھتا ہے۔ جدلیاتی حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے ہم و قت متغیر رہتی ہے اس کے ناقص پہلو فنا ہوتے رہتے ہیں، پرانے عقائد نئے تقاضوں اور احتیاجات کے دوش پر تحریب کا شکار ہوتے ہیں، اس تحریب سے نئی تعمیر جنم لیتی ہے۔ یہ نئی تعمیر نئے عہد کے مزید نئے تقاضوں کے سیاق و سبق میں قدامت کا پیر ہن اور ہلکتی ہے۔

نئے زمانے میں پرانے دور کا احیاناً ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ پرانا دور اپنے مخصوص تقاضے اور مخصوص احتیاجات رکھتا ہے، اور نئے دور کے اپنے پہلو اور اپنی جہتیں ہوتی ہیں، نئے زمانے کے تقاضوں اور احتیاجات سے منحرف ہونا تخلیل کی حیات پر ورقوتوں سے منحرف ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں نئی اور پرانی نسل میں باہمی آور یہاں اور کشمکش کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔ اس کشمکش کا ثابت فائدہ یہ ہونا ہے کہ نئی نسل اپنی مشکلم بندیاں دیں کی تلاش اور جستجو کے لئے بڑی محنت اور ریاضت سے کام کرتی ہے۔

اس بات کے منفی رخ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ کہ پرانی نسل آزاد اور کشاور فضائیں آنے کی بجائے نظریاتی انجمنادا اور یکسانیت کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ یوں بھی ادب مشین نہیں ہوتا کہ اس کے کل پزوں کو گھما کر جس نوع کا کام لینا چاہیں لے لیں۔ ادب آزادی کے عالم میں شھائیں مارنے والا وسیع اور کشاور سمندر ہے جس میں مختلف النوع اور بوقلمون روئیں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ نئی روئیں پیدا ہوتی ہیں۔ پرانی روئیں سے نکراوا اور آور آور یہاں کا عالم وجود میں آتا ہے۔

نئی روئیں نئے راستوں کی دریافت کے امکانات روشن کرتی ہیں۔ مردہ جذبے کے احساس کا نئی روئیں کا ہم دوش ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ جدید اردو نظم کی تحریک کے ہر مرحلے پر اسی قسم کے انداز نظر سے پالا پڑا ہے۔ حالی کے دور سے لے کر آج تک جدید شاعری میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہی۔ حالی کے عہد میں قدیم جاگیر دارانہ فضا کی شاعری سے گریز کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ اس عہد میں نئے حالات کے مطابق شاعری میں حال کے لمحوں کے مسائل کا عمل دخل ہوا۔ نئے حالات کے مطابق ہیئت کے تجربے بھی لازمی تھے چنانچہ یہ کام عبدالحیم شری اور عظمت اللہ خان

نے سرانجام دیا۔ رومانی تحریک کی پیدائش کے زمانے میں ہندوستانی معاشرے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ معاشرے میں فرد کی آزادی کی بلکل سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان حالات کا عکس رومانی شاعری کے علمبرداروں کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے شاعری کو صنعتی اور جاگیردارانہ معاشرے کی اقدار کا سیاق و سباق عطا کرتے ہوئے مزدور، کسان اور عوام کی معاشی، سیاسی اور فکری آزادی کے نعرے بلند کئے۔ نظم میں علامت نگاری کی تحریک کے زمانے میں نئے مغربی علوم اور فلسفیوں سے پیدا شدہ طرز احساس طرز عمل کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ چنانچہ فرد کے باطن کی گہری اور تہہ کیفیات کو گرفت میں لانے کا اہتمام ہوا۔ نئی شاعری کے زمانے میں ابہام اور ابلاغ کے مسائل پیدا ہوئے۔ قاری کے لئے نئی شاعری مبہم اور لا یعنی تھہری۔ نئے شاعروں نے اپنی ریاضت جاری رکھی۔ ان کی نظمیں قاری کی توجہ حاصل کرنے لگیں۔ نئی شاعری کے بعد آج کے عہد میں نظم میں فرد کے تجربات، واردات اور احساسات کی منتشر اور بکھری ہوئی داستان رقم ہو رہی ہے۔ زمانہ اسے بھی قبول کر رہا ہے۔ ان تمام ادوار میں مواد کے ساتھ ہیئت کے تجربے بھی لازمی تھے چنانچہ اردو نظم میں ہیتوں کی رنگارنگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آزاد اور حالی اور شر کا زمانہ رومانی اور ترقی پسند شاعری کا دور آج کے عہد کی شاعری کے مقابلے میں قدیم زمانہ اور دور ہے۔ آج کے عہد میں پرانی جدیدیت اور نئی جدیدیت کی اصطلاحیں وضع ہوئی ہیں، تجربات و احساسات کے ناقص پہلو فنا ہوئے، نئے عہد کے تقاضوں اور ضروریات نے نئے تجربات کی گنجائش نکالی۔ احساسات کے نئے پہلو اور نئی جہتیں پیدا ہوئیں۔ نظم کے ان ادوار میں نظم کے فتنی پہلوؤں پر بھی توجہ دی جاتی رہی۔ عروض و فنون، زبان و گرامر اور دیگر شعری لوازمات کی شکلیں بد لیں، بدل رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی۔

ان معروضات کی روشنی میں ن۔م۔ راشد کے چاروں شعری مجموعوں ”ماورا“، ”ایران میں اجنبی“، ”لا=انسان“ اور ”گماں کا ممکن“ کی چند نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ امید ہے اس انتخاب سے راشد کے اسلوب کے وہ پہلو سامنے آئیں گے جو نقادوں کی نظر سے اس لیے پوشیدہ رہے کہ انہوں نے ن۔م۔ راشد کی مقبول نظموں کے جائزوں پر اکتفا کیا ہے۔

(ڈاکٹر سعادت سعید)

ماورا

(مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور، طبع ثانی، س۔ن)

ایک رات

یاد ہے اک رات زیر آسمان نیلگوں،
 یاد ہے مجھ کو وہ تابتاں کی رات!
 چاند کی کرنوں کا بے پایاں فسول۔۔۔۔۔ پھیلا ہوا،
 سرمدی آہنگ بر ساتا ہوا۔۔۔۔۔ ہر چارسو!
 اور مرے پہلو میں تو۔۔۔۔۔!
 میرے دل میں یہ خیال آنے لگا۔۔۔۔۔
 غم کا بحر بے کراں ہے یہ جہاں
 میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
 سطحِ سورانگیز پر اس کی روائ
 ایک ساحل، ایک انجانے جزیرے کی طرف
 اس کو آہستہ لئے جاتا ہوں میں
 دل میں یہ جاں سوز و ہم
 یہ کبیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے!
 یاد ہے مجھ کو وہ تابتاں کی رات
 تیرے دل میں راز کی اک کائنات
 تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم
 سرخوش اظہار تیری ہر نگاہ
 تیرے مژگاں کے تلے گھرے خیال
 بے بسی کی نیند میں الجھے ہوئے۔۔۔۔۔
 تیرا چہرہ آگوں ہونے کو تھا
 دفعتاً، پھر جیسے یاد آجائے اک گم گشته بات

تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں
 میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لئے
 اپنی نکہت، اپنی مستی مجھ کو دینے کے لئے!
 غم کے بھر بے کراں میں ہو گیا پیدا سکوں
 یاد ہے وہ رات زیر آسمانِ نیلگوں
 یاد ہے مجھ کو وہ تابتاں کی رات!

سپاہی

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
 موت کا لمحہ مایوس نہیں
 قوم ابھی نیند میں ہے!
 مصلحِ قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
 اور ڈرلوں قوم کہیں جاگ نہ جائے۔۔۔۔۔
 میں تو اک عام سپاہی ہوں مجھے
 حکم ہے دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا
 اور اسی سعی جگر دوز میں جاں دینے کا
 تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
 راہ میں اوپنچے پہاڑ آئیں گے
 دشت بے آب و گیاہ
 اور کہیں رو دعمیق
 بے کراں تیز و کف آلود و عظیم
 اجڑے سنسان دیار
 اور دشمن کے گرانڈیل جوان
 جیسے کہ سارپہ دیودار کے پیڑ

عزت و عفت و عصمت کے غنیم

ہر طرف خون کے سیلا ب روائی۔۔

اک سپاہی کے لئے خون کے نظاروں میں

جسم اور روح کی بالیدگی ہے

تو مگر تاب کہاں لائے گی

تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

دم بدم بڑھتے چلے جاتے ہیں

سر میدانِ رفت،

تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

عمر گزری ہے غلامی میں مری

اس سے اب تک مری پرواز میں کوتا ہی ہے!

زمز مے اپنی محبت کے نہ چھیڑ

اس سے اے جان پروبال میں آتا ہے جمود

میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست

آسمانوں سے بھلا آئے گی؟

دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول

میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے؟

ان سے نکرانے بھی دے

جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے

تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

زوال

آہ پائیدہ نہیں،
در دل نہ کا یہ ہنگامِ جلیل!
پھر کئی بارا بھی آئینے لمحاتِ جنوں
اس سے شدت میں فزوں، اس سے طویل
پھر بھی پائندہ نہیں!

آپ ہی آپ کسی روز خبر جائے گا
تیرے جذبات کا دریاۓ روائی
تجھے معلوم نہیں،
کس طرح وقت کی امواج ہیں سرگرمِ خرام؟
تیرے سینے کا درخشدہ جمال
کر دیا جائے گا بیگانہ نور
نکہت ورنگ سے محرومِ دوام!
تجھے معلوم نہیں؟
اس در تپے میں سے دیکھ
خشک، بے برگ، المناک درختوں کا سماں
کیسا دل دوز سکوت!
زیرِ لب نالہ کش جو رخ زال
چودھویں رات کا مہتاب جواں!
ان کے اس پار سے ہے نزدِ طلوع
تجھے معلوم نہیں،

ایک دن تیرا جنوں خیز شباب
 تیرے اعضا کا جمال
 کر دیا جائے گا اس طرح سے محروم فسوں؟
 اور پھر چاند کے مانند محبت کے خیال
 سارے اس عہد کے گزرے ہوئے خواب
 تیرے ماضی کیا افق پر سے ہو یہا ہونگے
 تجھے معلوم نہیں،

اظہار

آہ میں بھی بھول جاؤں
زندگی سے اپنار بیٹ او لیں؟
ایک دور افتدہ قریے کے قریب
ایک جنوں افروز شام
نہر پر شیشم کے اشجار بلند
چاندنی میں ان کی شاخوں کے تلے
تیرے پیمانِ محبت کا وہ اظہار طویل!

روح کا اظہار تھے بو سے مرے
جیسے میری شاعری، میرا عمل!
روح کا اظہار کیسے بھول جاؤں؟
کیسے کرڈا لوں میں جسم و روح کو
آج بے آہنگ و نور؟
تو کہی اس وقت گنامی کے غاروں میں نہاں
میرے ہونٹوں ہی نے دی تجھ کو نجات
اپنی راہوں پر اٹھالا یا تجھے
زندہ جاوید کرڈا لاجھے
جیسے کوئی بت تراش
اپنے بت کو زندگی کے نور سے تباہ کرے
اُس کو برگ و باردینے کے لئے
اپنے جسم و روح کو عریاں کرے

میرے بوسے روح کا اظہار تھے
 روح جو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے
 ہے اُسی اظہار سے حاصل مجھے قربِ حیات،
 روح کا اظہار کیسے بھول جاؤں؟

آنکھوں کے جال

آہ تیری مدھری آنکھوں کے جال! -----

میز کی سطح درخشنده کو دیکھ

کیسے پیاناں کا عکسِ سیمگوں

اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا

جیسے میری روح، میری زندگی

تیری تابندہ سیہ آنکھوں میں ہے

مے کے پیانے تو ہٹ سکتے ہیں یہ ہٹنہیں!

تہوہ خانے کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں

آج کی شب تیرا دزادانہ ورود!

عشق کا یہجان، آدھی رات اور تیرا شباب

تیری آنکھ اور میرا دل

عنکبوت اور اس کا بے چارہ شکار!

تیرے ہاتھوں میں مگر لرزش ہے کیوں؟

کیوں ترا پیانہ ہونٹوں سے ترے ہمتا نہیں

خام و نوا آموز ہے تو ساحرہ!

کر رہی ہے اپنے فن کو آشکار
 اور اپنے آپ پر تجھ کو یقین حاصل نہیں!
 پھر بھی ہے تیرے فسول کے سامنے مجھ کو شکست
 میرے تخیلات، میری شاعری بیکار ہیں!

اپنے سر پر قتموں کے نور کا سیلا ب دیکھ
 جس سے تیرے چہرے کا سایہ ترے سینے پہ ہے
 اس طرح اندوہ میری زندگی پر سایہ ریز
 تیری آنکھوں کی درختانی سے ہے
 سایہ ہٹ سکتا ہے غم ہتا نہیں!
 آہ تیری مد مجری آنکھوں کے جال!
 دیکھ وہ دیوار پر تصویر دیکھ
 یا اگر چاہے کہ اس کا آفرینندہ کبھی
 اس کے ہاتھوں میں ہو مغلوب وا سیر
 کیسا ہی بے معنی ہے یا اس کا خیال
 اس کو پھرا پنی ہر بیت کے سوا چارہ نہیں!
 تو مری تصویر تھی،
 میرے ہوننوں نے تجھے پیدا کیا

آج لیکن میری مدھوٹی کو دیکھے

میں کہ تھا خود آفریندہ ترا

پابجول اس میرے جسم دروح تیرے سامنے

اور دل پر تیری آنکھوں کی گرفت ناگزیر،

ساحری تیری خداوندی تری!

عکس کیسا بھی ہوفانی ہے مگر

یہ نگاہوں کا فسوس پایندہ ہے!

گناہ

آج پھر آہی گیا
 آج پھر روح پوہ چھاہی گیا
 دی مرے گھر پر شکست آ کے مجھے!
 ہوش آیا تو میں دلپیز پہ افتادہ تھا
 خاک آ لودہ وا فردہ و علگمین وززار
 پارہ پارہ تھے مری روح کے تار
 آج وہ آہی گیا!
 روزن در سے لرزتے ہوئے دیکھا میں نے
 خرم و شادر راہ اُسے جاتے ہوئے
 سالہا سال سے مسدود تھا یارانہ مرا
 اپنے ہی بادہ سے لبریز تھا پیانہ مرا
 اس کے لوث آنے کا امکان نہ تھا
 اس کے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
 پھر بھی وہ آہی گیا
 کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
 بے بسی میرے خداوند کی تھی

شاعر در ماندہ

زندگی تیرے لئے بستر سنجاب و سمور
اور یہ لئے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوئی آبا کے طفیل؛

میں ہوں در ماندہ و بے چارہ ادیب
حستہ فکرِ معاش!

پارہ ناں جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
میں، مرے دوست، مرے سینکڑوں ارباب وطن
یعنی افرنگ کے گزاروں کے پھول

تجھے اک شاعر در ماندہ کی امید نہ تھی
مجھ سے جس روز ستارہ ترا او باستہ ہوا
تو سمجھتی تھی کہ اک روز مرا ذہن رسا
اور مرے علم دہنر

بحدو برسے تری زینت کو گہر لا کئے گے!

میرے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب
کیوں دعا کئیں تری بے کار نہ جائیں
تیرے راتوں کے بجود اور نیاز
اس کا باعث مراد الہاد بھی ہے!

اے مری شمعِ شبستان وفا
بھول جا میرے لئے

زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے!
 تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
 اور اگر ہے، تو سراپر دہ نیان میں ہے
 تو ”مرت“ ہے مری تو مری ”بیداری“ ہے
 مجھے آغوش میں لے
 دو ”انا“، مل کے جہاں سوز بھیں
 اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاوں میں تلاش
 آپ ہی آپ ہو یہا ہو جائے!

شرابی

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ سامان ہو گئیں!

شکر کرائے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں،
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغوان
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینہ سوزاں کی آگ؟

غم سے مر جاتی نہ تو

آج پی آتا جو میں
جامِ رنگیں کی بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا ہو؟

شکر کرائے جاں کہ میں

ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں!

خودگشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری۔۔۔۔۔
 شام سے پہلے ہن کر دیتا تھا میں
 چاٹ کر دیوار کو نوکِ زبان سے ناتواں
 صح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
 رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
 تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
 منہ ب سورے، رہگزاروں سے لپٹتے سو گوار!
 گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا۔
 میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
 کو دجاوں ساتویں منزل سے آج!
 آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
 آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
 ایک عشوہ ساز و ہرزہ کا محبوبہ اکے پاس
 اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
 آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
 تازہ و رخشاں لہو،
 بوئے میں بوئے خون ابھی ہوئی!
 وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
 اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری!
 جی میں آئی ہے لگادوں ایک بیڑا کانہ جست
 اس درستے میں سے جو

جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے دبام کو!
 شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
 چاٹ کر دیوار کو نوکِ زبان سے ناتواں
 صح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
 آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی!

۱۔ مراد زندگی

زنجر

گوشہ زنجیر میں
 اک نئی جنبش ہو یہا ہو چلی
 سنگ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
 دشمن جاں دشمن جاں ہی سہی
 دوست سے دست و گریباں ہی سہی
 یہ بھی تو شبتم نہیں۔
 یہ بھی تو محمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں۔

ہر جگہ پھر سینہ نجیر میں
 اک نیا ارمائ، نئی امید پیدا ہو چلی
 جملہ سیمیں سے تو بھی پیله ریشم نکل
 وہ حسیں اور دُورافتادہ فرنگی عورتیں
 تو نے جن کے حصِ روز افزوس کی زینت کے لئے
 سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تارہائے سیم وزر
 ان کے مردوں کے لئے بھی آج اک سنگین جاں
 ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال
 شکر ہے دنبارہ زنجیر میں
 اک نئی جنبش، نئی لرزش ہو یہا ہو چلی
 کوہ ساروں، ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
 ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاؤ
 پردہ شکر میں اپنے سلاسل توڑ کر

چار سو چھائے ہوئے نظمات کو اب چیر جاؤ
 اور اس ہنگام مباداً ور کو
 حیله شب خوں بناؤ!

خرابے

اک تمنا تھی کہ میں
 اک نیا گھر، نئی منزل کہیں آباد کروں
 کہ مر اپہلا مکان
 جس کی تعمیر میں گزرے تھے مرے سات برس
 اک کھنڈ رہنا چلا جاتا تھا
 یہ تمنا تھی کہ شور یہہ سری
 خشت اور سنگ کے انبار لگائی ہی رہے
 روز و شب ذہن میں بنتے ہی رہیں
 درود یوار کے خوش رنگ نقش
 مجھ کو تخلیل کے صحراء میں لیے پھرتا تھا
 ایک آفت زدہ دیوانے کا جوش
 لے گئے میرے قدم آخ کار
 ایک دن اپنے نئے گھر میں مجھے
 خیر مقدم کو تھیں موجود جہاں
 میری گل چہرہ کنیزیں، مرے دل شاد غلام
 دیکھ کر اپنی تمناؤں کی شادابی کو
 میرے اندر یہے کی دلیز سے معدوم ہوئے
 میرے ماضی کے سیہ تاب، المناک نشاں
 یہ مگر کیا تھا، خیالات تھے، اوہام تھے دیوانے کے
 نہ وہ گل چہرہ کنیزیں تھیں نہ دل شاد غلام
 درود یوار کے وہ نقش نہ دیواریں تھیں

سنگ اور خشت کے ڈھیروں پہ تھا کائی کانزول
 اور وہ ڈھیر بھی موجود نہ تھے
 کھل گئے تھے کسی آئندہ کی بیداری میں
 میرے خود ساختہ خواب
 میں اسی پہلے خرابے کے کنارے تھا نگوں
 جس سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
 کس لئے ہے مری محرومی کی حاسداب بھی
 کسی منحوس ستارے کی غضبناک نگاہ
 اور ادھر بندہ بد بخت کی تہائی کا یہ رنگ کہ وہ
 اور بھی تیرہ دغمناک ہوئی جاتی ہے

ایران میں انجینئری

(مطبوعہ: لاہور: مکتبہ المثال، طبع چہارم ۱۹۶۹ء)

آواز

یہ دلی ہے
 اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لئے
 ہار غزلوں کے لائی ہے ان کے بہن
 اور گیتوں کے گھرے بنانکر:
 ”چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رئے“
 ”یہ دنیا ہے طوفان میل“
 ”اے مدینے کے عربی جواں“
 ”تیری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر ...“

مگر اس صدای سے بڑا ناگ ممکن ہے
 جو لے گیا ایک پل میں
 ہزاروں کو گوار فراموشگاری
 میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
 کہ صدیاں گزرنے پر ان کی
 سیہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟

جبہاں سے یہ آواز آئی
 اُسی سرز میں میں،
 سمندر کے ساحل پہ، لاکھوں گھروں میں
 دیے ٹھٹھانے لگے
 اور اک دوسرے سے

بہت دھمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے:

لوسنو، اب سحر ہونے والی ہے لیکن
سافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے!

دوری

مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں،
 تجھے موت آئے گی، مر جائے گی تو،
 وہ پہلی شبِ مہ شہ ماہِ دو نیم بن جائے گی
 جس طرح سازِ کہنہ کے تاریخ نکتہ کے دنوں سرے
 دو افقت کے کناروں کے مانند
 بس دُورتی دُور سے تحریراتے ہیں اور پاس آتے نہیں ہیں
 نہ وہ راز کی بات ہونوں پہلاتے ہیں
 جس نے مخفی کو دو ریزم و مکاں سے نکالا تھا
 بخشی تھی خوابِ ابد سے رہائی ا

یہ حج ہے تو پھر کیوں
 کوئی ایسی صورت، کوئی ایسا حیله نہ تھا
 جس سے ہم آنے والے زمانے کی آہٹ کو سُن کر
 وہیں اس کی یورش کو سینوں پہ یوں روک لیتے:
 کہ ہم تیری منزل نہیں، تیرا طباوماوی نہیں ہیں؟

یہ سوچا تھا شاید
 کہ خود پہلے اس بعد کے آفریندہ بن جائیں گے
 [اب جواک بحرِ خمیازہ کش بن گیا ہے!]
 تو پھر از سرِ نومرت سے، نورِ نئی فاتحانہ مرت سے
 پائیں گے بھولی ہوئی زندگی کو۔

وہی خود فرمی، وہی اشک شوئی کا ادنی بہانہ!

مگر اب وہی بعد سر گوشیاں کر رہا ہے:
کہ تو اپنی منزل کو واپس نہیں جاسکے گا،
نہیں جاسکے گا۔۔۔

مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں،
تجھے موت آئے گی، مر جائے گی تو
یہ عفریت پہلے ہزیمت اٹھائے گا، مٹ جائے گا!

انقلابی

”مورخ“، مزاروں کے بستر کا بارگراں
عروں اس کی نارستمناؤں کے سوز سے
آہ برلب
جدائی کی دلپیز پر، زلف درخاک، نوحہ کنایا!
یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اس غم زدہ سے
کہا: لا وَ، اب لا وَ، دریوزہ غمزہ جانتا!

مگر خواہشیں اشہبِ باد پیا نہیں،
جو ہوں بھی تو کیا
کہ جو لانگہ وقت میں کس نے پایا ہے
کس کا نشاں؟

یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارانہ تھا،
کہ تاریخ دانوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی روح روای کو اجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟

جو آنکھوں میں اُس وقت آنسو نہ ہوتے،
تو یہ مضطرب جاں،

یہ ہر تازہ و نوبنور نگ کی دربا،

تری اس پذیرائی جسم دلب سے

وفا کے شہرے جزیروں کی شہزاد ہوتی،

ترے ساتھ منزل بمنزل رواں و دواں!

اسے اپنی ہی زلف و گیسو کے دام ازل سے

رہائی تو ملتی،

مگر تو نے دیکھا بھی تھا

دیوتا تار کا جھرہ تار

جس کی طرف تو اسے کر رہا تھا اشارے،

جہاں بام و دیوار میں کوئی روزان نہیں ہے

جہاں چار سو بادو طوفاں کے مارے ہوئے راگیروں

کے بے انتہا استخوان ایسے بکھرے پڑے ہیں

ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر فغاں؟

ظلہ رنگ

”یہ میں ہوں“

”اور یہ میں ہوں!“ ---

یہ دو میں ایک سیم نیلگوں کے ساتھ آ ویزاں
ہیں شرق و غرب کے مانند،
لیکن مل نہیں سکتے!

صدائیں رنگ سے نا آشنا

اک تاراں کے درمیاں حائل!

مگر وہ ہاتھ جن کا بخت،

مشرق کے جواں سورج کی تابانی

کبھی ان زرم و نازک، برف پر دردہ حسیں با ہوں

کوچھو جائیں،

محبت کی کمیں گا ہوں کوچھو جائیں۔۔

یہ ناممکن! یہ ناممکن!

کہ ”ظلہ رنگ“ کی دیواراں کے درمیاں حائل!

”یہ میں ہوں“

”اور یہ میں ہوں!“

انا کے زخم خوں آ لودہ، ہر پر دے میں،

ہر پوشک میں عریاں،

یہ زخم ایسے ہیں جو اشک ریا سے سلنہیں سکتے

کسی سوچے ہوئے حرف و فاء سے سلنہیں سکتے

طلسمِ ازل

مجھے پھر طسمِ ازل نے
نئی صبح کے نور میں شیم وا،
شرم آگیں در تپے سے جھانکا!

میں اس شہر میں بھی،
جہاں کوئے و بر زن میں بکھرے ہوئے
حسن و رقص و مے و نور و نغمہ
اُسی نقشِ صدر گنگ کے خط و محراب ہیں، تار و پو ہیں،
کہ صدیوں سے جس کے لئے
نور انساں کا دل، کان، آنکھیں،
سب آوارہ جستجو ہیں،
میں اس شہر میں تھا پریشاں و تنہا!

یہاں زندگی ہے اک آہنگِ تازہ
مسلسل، مگر پھر بھی تازہ
یہاں زندگی الحمد لله، نئے، دمبدوم تیز تر
جو شے سے گام زن ہے،
یہاں وہ سکون، جس کے گہوارہ نرم و نا زک
میں پلتے ہیں ہم ایشیائی
فقط دُور تھی دُور سے خندہ زن ہے،

مگر میں اسی شہر میں تھا پریشان و غمگین و تنہا!

پریشان و غمگین و تنہا

کہ ہم ایشیائی

جو صدیوں سے ہیں خواب تمکیں کے ریا

یہ کہتے رہے ہیں:

ہمارا ہوزخم افرنگ کی موسمیائی

ہمارے ہی دم سے جلال شہی، فرہ کبریائی

پریشان و غمگین و تنہا

کہ ہم تابکے اپنے اوہام کہنے کے دلبدن بُن کر،

یونہی عافیت کی پُر اسرار لذت کے آغوش سے

زہر تقدیر پیتے رہیں گے

ابھی اور کے سال دریوزہ گر بن کے جیتے رہیں گے!

اسی سوچ میں تھا کہ مجھ کو

طلسم ازال نے نئی صبح کے نور میں نیم وا،

شرم آگیں دریچے سے جھانا کا۔۔۔۔۔

مگر اس طرح، ایک چشمک میں جیسے

ہمالہ والوند کے سینہ آہنی سے

محبت کا اک بے کراں سیل بننے لگا ہو

اور اس سیل میں سب ازال اور ابدل گئے ہوں!

سایہ

کسی خواب آلو دہ سائے کا پیکر
 کہاں تک ترے گوش شنووا، تری چشم پینا، ترے قلب دانا
 کا بجاو ماوئی بنے گا؟

تجھے آج سائے کے ہونٹوں سے حکمت کی باتیں گوارا،
 تجھے آج سائے کے آغوش میں شعر و نغمہ کی راتیں گوارا،
 گوارا ہیں اُس زندگی سے کہ جس میں کئی کارروائی را پیار ہے ہیں!
 مگر کل ترے لب پہلی سی آہوں کی لپشیں انھیں گی،
 تر ادل انہی کارروانوں کو ڈھونڈے گا
 اُن کو پکارے گا،
 جو جسم کی چشمہ گاہوں پر رکتے ہیں آ کر
 جنہیں سیری جاں کی پوشیدہ را ہوں کی ساری خبر ہے!

یہ تسلیم، سائے نے تجھ کو
 وہ پہنائیاں دیں
 افق سے بلند اور بالا
 جو تیری نگاہوں کے مرئی جوابوں میں پہاں رہی تھیں،
 وہ اسرار تجھ پر ہو یہا کیے، جن کا ارمائ
 فلاطوں سے اقبال تک سب کے سینوں کی دولت رہا ہے؛

وہ اشعار تجھ کو نائے، جو حاصل ہیں ور جل سے لے کر
 سبک مایہ راشد کے سوزِ دروں کا
 کہ تو بھول جائے وہ صرصر، وہ گرداب جن میں
 تری زندگی واٹگوں تھی،
 تری زندگی خاک و خون تھی!
 تو اسرار و اشعار سنتی رہی ہے،
 مگر دل ہی دل میں تو ہنستی رہی ہے
 تو سیال پیکر سے، سائے سے، غم کے کنائے سے کیا پاسکے گی؟
 جب اس کے ورا، اس سے زندہ تو انابدن
 رنگ ولذت کے مخزن، ہزاروں،
 تمنا کے مامن ہزاروں!

کبھی خواب آ لودہ سائے کی مجبور غم دیدہ آ نکھیں
 ترے خشک مژگاں کو رنجور دنم دیدہ کرتی رہی ہیں
 تو پھر بھی ٹو ہنستی رہی ہے!

زندگی میری سہ نیم

میں سہ نیم اور زندگی میری سہ نیم
دوست داری، عشق بازی، روزگار
زندگی میری سہ نیم!

دوستوں میں دوست کچھ ایسے بھی ہیں
جن سے وابستہ ہے جاں،
اور کچھ ایسے بھی ہیں، جورات دن کے ہم پیالہ، ہم نوالہ
پھر بھی جیسے دشمنِ جانِ عزیز!
دوستی کچھ دشمنی اور دشمنی کچھ دوستی
دوستی میری سہ نیم!

عشق محبوبہ سے بھی ہے اور کتنی اور محبوباؤں سے،
ان میں کچھ ایسی بھی ہیں
جن سے وابستہ ہے جاں
اور کچھ ایسی بھی ہیں جو عطر بالیں، نور بستر
پھر بھی جیسے دشمنِ جانِ عزیز!
ان میں کچھ نگرانِ دانہ اور کچھ نگرانِ دام
عشق میں کچھ سوز ہے، کچھ دل لگی، کچھ "انتقام"
عاشقی میری سہ نیم!

روزگارِ اک پارہ ناں جویں کا حیلہ ہے
 گاہ یہ حیلہ ہی بن جاتا ہے دستورِ حیات
 اور گاہ ہے رشتہ ہائے جان و دل کو بھول کر
 بن کے رہ جاتا ہے منظورِ حیات
 پارہ ناں کی تمنا بھی سہ نیم
 میں سہ نیم اور زندگی میری سہ نیم!

حرفِ نا گفتہ

حرفِ نا گفتہ کے آزار سے ہشیار رہو
کوئے و بربز کو

دروبام کو
شعلوں کی زبان چاٹی ہو،

وہ دم بستہ ولب دوختہ ہو۔۔۔۔۔
ایسے گنہ گار سے ہشیار رہو!

شخنہ شہر ہو یا بندہ سلطان ہو
اگر تم سے کہے: ”لب نہ ہلاوَ“

لب ہلاوَ نہیں، لب ہی نہ ہلاوَ

دست و بازو بھی ہلاوَ،

دست و بازو کوز بان ولب گفتار بناؤ
ایسا کہرام مجاوَ کہ سدا یاد رہے،

اہل دربار کے اطوار سے ہشیار رہو!

ان کے لمحات کے آفاق نہیں۔

حرفِ نا گفتہ سے جو لحظہ گز رجائے

شب وقت کا پایاں ہے وہی!

ہائے وہ زہر جو صدیوں کے رگ و پے میں سما جائے

کہ جس کا کوئی تریاق نہیں!

آج اس زہر کے بڑھتے ہوئے

آثار سے ہشیار رہو

حرف ناگفتہ کے آزار سے ہشیار رہو!

یہ دروازہ کیسے کھلا؟

یہ دروازہ کیسے کھلا؟ کس نے کھولا؟

یہ کتبہ جو پتھر کی دیوار پر بے زبان سوچتا تھا

ابھی جاگ اٹھا ہے،

وہ دیوار کھولے ہوئے نقش گر کی کہانی

نانے لگی ہے؛

نکیلے ستون پر وہ صندوق، جس پر

یہ رنگ ریشم میں لپٹا ہوا ایک کتے کا بت،

جس کی آنکھیں سنہری،

ابھی بھونک اٹھا ہے؛

وہ لکڑی کی گائے کاسر

جس کے پیتل کے سینگوں میں بربط،

جو صدیوں سے بے جان تھا

جھنجھنا نے لگا ہے؟

وہ ننھے سے ہوتے جو عجلت میں اک دوسرے سے

الگ ہو گئے تھے؛

یا کا یک بھمل کے، اتر اکے چلنے لگے ہیں۔

وہ پایوں پر رکھے ہوئے تین گلداں

جن پر بزرگوں کے پا کیزہ یا کم گنہ گار

جسموں کی وہ را کھجو [اپنی تقدیر مبرم سے نج کر]
 فقط تیرہ تر ہو گئی تھی،
 اسی میں پچھپے کتنے دل
 تملانے لگے ہیں؟

یہ دروازہ کیسے کھلا؟ کس نے کھوا؟
 ہمیں نے ----

ابھی ہم نے دہلیز پر پاؤں رکھا نہ تھا
 کواڑوں کو ہم نے چھواتک نہ تھا
 کیسے یکدم ہزاروں ہی بے تاب چہروں پر
 تارے چمکنے لگے
 جیسے ان کی مقدس کتابوں میں
 جس آنے والی گھڑی کا حوالہ تھا
 گویا یہی وہ گھڑی ہو!

خلوت میں جلوت

حسن اپنا ساتھی

جو اس رات، نوروز کے ہال
 جمالِ عجم کے طلسماں میں بہہ گیا تھا
 پھر اک بار مستی میں جلوت کو خلوت سمجھ کر
 بڑی دیر تک رو برو آئنے کے
 کھڑا نجھولتا منہ چڑا تارہا تھا،
 وہ بلور کی بے کراں جھیل کے دیو کو گالیاں دے کے ہفتارہا تھا،
 حسن اپنی آنکھوں میں رقت کا سیلا ب لا کر
 زمستاں کی اس شام کی تازہ مہماں سے
 اس شہر آشوب طہراں سے
 کہتا چلا جا رہا تھا:
 تو میری بہن ہے،
 تو میری بہن ہے،
 ”اٹھاے میری پیاری بہن میری زہرا!
 ابھی رات کے در پر دستک پڑے گی،
 تجھے اپنے کاشانہ ناز میں چھوڑ آؤں!“
 اور اس پر برافروختہ تھے،
 پریشاں تھے سب ہم!

جونہی اس کو جعفر نے دیکھا نگاہیں بدل کر
وہ چلا کے بولا

"درندو"

اسے چھوڑ دو،
اس کے ہاتھوں میں
انگشتی کا نشاں تک نہیں ہے!"

حسن مردِ میداں تو تھا ہی
مگر نارساں کا احساس
مستی کے شادابِ لمحوں میں اس سے
کرا تا تھا اکثر
یہ عہدِ سلاطین کے گذرے ہوئے
شہسواروں کے عالم کی باتیں!

مگر جب سحرگاہِ اردو میں قرن نا ہوئی
اور البرز کی چوٹیوں پر بکھر نے لگیں پھر شاعریں
تو آنکھیں کھلی رہ گئیں ساتھیوں کی،
حسن کے رخ و دست و بازو
خرashوں سے یوں نیلگوں ہو رہے تھے
کہ جیسے وہ جنوں کے زرعے میں شب بھر رہا ہو

ہمیں سب کو جعفر پر شک تھا

کہ شاید اسی نے نکالا ہو یہ اپنے بد لے کا پھلو!

مگر جب حسن اور جعفر نے

دونوں نے

کھائیں کئی بار فرمیں

تونا چار لب دو ختہ ہو گئے ہم

وہاں اب وہ جان عجم بھی نہ تھی

جس سے ہم پوچھ سکتے;

ذررا اور کاوش سے پوچھ حسن سے

تو بے ساختہ نہیں کے کہنے لگا۔ ”بس، مجھے کیا خبر ہو؟“

اگر پوچھنا ہو تو زہرا سے پوچھو

مری رات بھر کی بہن سے!“

وزیرے چنیں

--- توجہ سات سو آٹھویں رات آئی

تو کہنے لگی شہزادو:

”اے جواں بخت

شیراز میں ایک رہتا تھا نائی؛

وہ نائی تو تھا ہی،

مگر اس کو بخشنا تھا قدرت نے،

اک اور نادر، گراں تر ہنز بھی،

کہ جب بھی،

کسی مرد دانا کا ذہنِ رسما،

زنگ آ لودہ ہونے کو آتا

تونائی کو جا کر دکھاتا،

کہ نائی دماغوں کا مشہور ماہر تھا،

وہ کاسئے سر سے ان کو الگ کر کے،

ان کی سب آلاتیں پاک کر کے،

پھر اپنی جگہ پر لگانے کے فن میں تھا کامل!

خدا کا یہ کرنا ہوا،

ایک دن

اس کی ڈکاں سے

ایران کا اک وزیر کہن سال گذر ا

اور اس نے بھی چاہا

کہ وہ بھی ذرا

اپنے آجھے ہوئے ذہن کی

از سرِ نو صفائی کرائے!

کیا کاسنے سر کونائی نے خالی،

ابھی وہ اسے صاف کرنے لگا تھا،

کہ ناگاہ آ کر کہا ایک خواجہ سرانے:

”میں بھیجا گیا ہوں جنابِ وزارت پنہ کو بلانے!“

اور اس پر

سر ایسمہ ہو کر جوانہ ٹھاوزیر ایک دم،

رہ گیا پاس دلائک کے مغزاں کا

وہ بے مغز سر لے کے دربارِ سلطان میں پہنچا!

۔۔۔۔۔ مگر دوسرے روز اس نے

جونائی سے آ کر تقاضا کیا

تو وہ کہنے لگا:

”حیف،

کل شب پڑوی کی بلی

کسی روز ن در سے گھس کر

جنابِ وزارت پنہ کے

دماغِ فلک تاز کو کھا گئی ہے!

اور اب حکم سر کار ہو تو،
 کسی اور حیوان کا مغز لے کر لگا دوں؟“
 تو دلاک نے رکھ دیا،
 دانیال زمانہ کے سر میں،
 کسی بیل کا مغز لے کر!
 تولوگوں نے دیکھا
 جناب وزارت پناہ،
 فرات میں
 دانش میں
 اور کار و بار وزارت میں،
 پہلے سے بھی چاق و چوبندر ہو گئے ہیں!

شاخ آ ہو

وزیر معارف علی کیانی نے

”شمیر ایاں“ کا تازہ مقالہ پڑھا،

او محسن فرحزاد کی تازہ ”تصنیف“ دیکھی

جو طہران کے سب تماشاگروں میں

کئی روز سے قہقہوں کے سمندر بہانے لگی تھی

تو وہ سر کھجانے لگا

اور کہنے لگا:

”لواسے کہہ رہے ہیں،“

علی کیانی کی تازہ جنایت!

بھلا کون سا ظلم ڈھایا ہے میں نے

جو بانور ضا بھانی سے

اسی ہزار اور نو سوریاں

اپنا حق جان کر

راہداری کے بد لے لیے ہیں؟

خدا نے تو انہا و برتر

وزارت ہے وہ درود سر

جس کا کوئی مدد اونہیں ہے!

ضابھانی ولایت سے

ڈگری طباعت کی لے کر،
 جولوٹے گی
 کچھ تو کمائے گی،
 پہلے سے بڑھ کر کمائے گی آخر
 اور اس پر یہ ایراں فروٹی کے طعنے
 یہ کہرام، اے مخترے روزنامہ نگارو!
 یہاں سات بچوں کے تنور
 ہر لحظہ فریاد کرتے ہوئے،
 اور خانم کے
 گلگونہ و غازہ و کفشنہ و موزہ کے
 یہ روزافزوں تقاضے،
 ادھر یہ گرانی،
 ادھر یہ وزارت کی گرسی
 فقط شاخ آ ہو!

تو اس پر علی کیانی نے سوچا،
 انھیاں قلم اور لکھا:
 ”جناب مدیر شہیر
 آپ کی خدمتِ فائقہ کے عوض
 دس ہزار اور چھ سو روپیال
 آپ کو صد ہزار احترامات کے ساتھ

تقدیم کرتا ہے بندہ!“

یہ پرکالہ آتشیں چھوڑ کر

اور مقالہ و ”تصنیف“ کی یاد دل سے بھلا کر

لگانخوا لئے اپنی کرسی میں آسودہ ہو کر

وزیر معارف علی کیا نی!

لَا = انسان

(مطبوعة: مكتبة المثال، لاہور، ۱۹۶۹ء)

مہمان

میں اس شہر میں مہمان اترا
 تو سینے میں غم اور آنکھوں میں آنسو کے طوفاں
 جدائی سے ہر چیز حسن ازال تک وہ پردہ
 کہ جس کے دراہی رت خیرگی تھی!
 جدائی سے تو بھی حزیں
 اور ترا خشم مجھ سے بھی گہرا تھا خوں دادہ تر تھا!

میں مہمنی امید تو ساتھ لایا تھا لیکن،
 تو اک شاخارِ شکست کے مانند بے آرزو!
 ۔۔۔۔۔ وہ بے آرزوئی کا گہرا اخلاجس کو میں نے
 کبھی ذہن بے ما یہ جانا
 کبھی خوف و نفرت کے عفريت کا سا یہ جانا!

تجھے یادِ محبوب کا نرم راحت سے لبریز باش
 تجھے یادِ کمرے کے شام و پگا، جن میں تو نے
 ستاروں کے خوشیوں کی آواز دیکھی
 بنفشه کے رنگوں کو تو نے چکھا
 اور بہشتی پرندوں کے نغموں کو چھوٹی رہی

تجھے اس کی پرواز کی آخری رات بھی یاد تھی۔۔۔
 لذتِ غم سے بے خواب لے
 جو صدیوں سے بھر پور، صدیوں کی
 پہنائی بنتے چلے جا رہے تھے

ادھر میں وہ مجبور، افسر دہ، تنہا
 وہ شب نم کا قطرہ
 جو صحراء میں نازل ہو لیکن
 سمندر سے ملنے کا روایا لیے ہو!

میں افسر دہ، مجبور، تنہا
 کہ محبوب سے بعد کونور کے سالہا سال سے
 ناپتا آ رہا تھا،
 مگر کونور کے سال اک خط پیانہ بھی تو
 نہیں بن سکے تھے!

نئی سرز میں کی نئی اجنبی،
 تجھے میں نے اک خواب پیا کی آنکھوں سے دیکھا
 کہ اس روز تجھ کو عیاں دیکھنا
 ایسا الحاد ہوتا
 کہ جس کی سزا جسم و جاں سہہ نہ سکتے!

مگر میرے دل نے کہا
 اجنبی شہر کی خلوتِ بے نہایت میں تو بھی
 کسی روز بن کر رہے گی
 تم ہائے تازہ کی خواہش کا پرتو!

ز خود رشتگی سے، اشاروں سے، ترغیب و اسے
 سمجھے میں بلا تارہاتھا
 تو آہستہ، خاموش بڑھنے لگی تھی
 کہ یادیں ابھی تک ترے دل میں یوں گونجتی تھیں
 کہ ہم گوش برلب سہی،
 سن نہ سکتے تھے اک دوسرے کی صدائیں!

مگر جب ملے ہم تو ایسے ملے
 وہ تری خود نگہداریاں کام آئیں
 نہ میرا تمذبب مجھے راس آیا
 ہم ایسے ملے جیسے صد یوں کے مجھوں
 آدم کے جشنِ ولادت کے مجھوں
 باہم ابد میں ملیں گے!

ریگ دیروز

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
 وقت کے طولِ المناک کے پروردہ ہیں
 ایک تاریک ازل نورِ ابد سے خالی!
 ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
 اپنی تہذیب کی پا کو بی کا حاصل پایا!

ہم محبت کے نہاں خانوں میں بنے والے
 اپنی پامالی کے افسانوں پہننے والے
 ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا!

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
 کنجِ ماضی میں ہیں باراں زده طاڑ کی طرح آسودہ
 اور کبھی فتنہ ناگاہ سے ڈر کر چونکیں
 تور ہیں سدنگاہ نیند کے بھاری پردے
 ہم محبت کے خرابوں کے مکیں!

ایسے تاریک خرابے کہ جہاں
 دور سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آ ہو
 ایک، بس ایک صد اگو بخت ہو
 شبِ آلام کی ”یا ہو! یا ہو!“

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
 ریگِ دنیوں میں خوابوں کے شجروتے رہے
 سایہ ناپید تھا، سائے کی تمنا کے تلے سوتے رہے!

بوئے آدمزاد

-- بوئے آدمزاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں؟
 دیواں جنگل کے سنائے میں ہیں
 ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں!

-- یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں سدا
 چاندنی راتوں میں وہ بے خوف و غم رقصان رہے
 آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں ہاتھ سرد
 ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
 ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد
 ایسے دیوں کے لئے بس ایک ہی جھونکا بہت
 کون ہے باب نبرد؟

-- ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
 دیکھتا ہے بے صدا، تولیدہ شاخوں سے انہیں
 ہو گئے ہیں کیسے اس کی بوئے ابتر حال دیو
 بن گئے ہیں موم کی تمثالت دیو!

-- ہاں اتر آئے گا آدمزاد ان شاخوں سے رات
 حوصلے دیوں کے مات!

آئندہ حس و خبر سے عاری!

آئینہ حس و خبر سے عاری
 اس کے نابود کو ہم ہست بنا میں کیے؟
 منحصر ہست تگاپوئے شب و روز پہ ہے
 دل آئینہ کو آئینہ دکھائیں کیے؟
 دل آئینہ کی پہنائی بے کار پہ ہم رو تے ہیں
 ایسی پہنائی کہ بزہ ہے نمودے محروم
 گلِ نورستہ ہے بو سے محروم!
 آدمی چشم و لب و گوش سے آراستہ ہیں
 لطفِ ہنگامہ سے نورِ مسن و تو سے محروم!
 مے چھلک سکتی نہیں، اشک کے مانند یہاں
 اور نشے کی جعلی بھی جھلک سکتی نہیں
 نہ صغاۓ دل آئینہ میں شورش کا جمال
 نہ خلاۓ دل آئینہ گذر گا و خیال!

آئندہ حس و خبر سے عاری
 اس کے نابود کو ہم ہست بنا میں کیے؟
 آئینہ ایسا سمندر ہے جے
 کر دیا دستِ فسون گرنے ازل میں ساکن!

عکس پر عکس در آتا ہے یا امید لئے
اس کے دم ہی سے فسوں دل تھاٹوں نے
یہ سکوتِ اجل آسائوں گے!

آئندہ ایک پر اسرار جہاں میں اپنے
وقت کی اوس کے قطروں کی صداستنا ہے،
عکس کو دیکھتا ہے، اور زبان بند ہے وہ
شہرِ مدفون کے مانند ہے وہ!
اس کے نابود کو ہم ہست بنا کیس کیے؟
آئندہ حس و خبر سے عاری!

زندگی اک پیرہ زن!

--- زندگی اک پیرہ زن!

جمع کرتی ہے گلی کو چوں میں روز و شب پر انی دھیاں!

تیز، غم انگیز، دیوانہ بُنی سے خندہ زن

بال بکھرے، دانت میلے، پیر، ہن

دھیوں کا ایک سونا اور ناپیدا کراں، تاریک بن!

--- لوہوا کے ایک جھونکے سے اڑی ہیں ناگہاں

ہاتھ سے اس کے پرانے کاغذوں کی بالیاں

اور وہ آپے سے باہر ہو گئی

اس کی حالت اور ابتر ہو گئی

سمہ سکے گا کون یہ گہرا زیاں؟

--- اب ہوا سے ہار تھک کر جھک گئی ہے پیرہ زن

جھک گئی ہے پاؤں پر، جیسے دفینہ ہو دہاں!

زندگی، تو اپنے مااضی کے کنوئیں میں جھاٹک کر کیا پائے گی؟

اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے، سونے کنوئیں میں

جھاٹک کر اس کی خبر کیا لائے گی؟

--- اس کی تہبہ میں نگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں

جز صدا کچھ بھی نہیں

آرزو را ہبھے ہے

— آرزو را ہبھے ہے بے کس و تنہا و حزیں
 آرزو را ہبھے ہے، عمر گزاری جس نے
 انہی محروم ازل را ہبوں، معبد کے نگہبانوں میں
 ان مہ مسالِ یک آہنگ کے ایوانوں میں!
 کیسے معبد پہ ہے تاریکی کا سایہ بھاری
 روئے معبد سے ہیں خون کے دھارے جاری

— را ہبھے رات کو معبد سے نکل آتی ہے
 جھلما لاتی ہوئی اک شمع لئے
 لڑکھڑاتی ہوئی فرش و درود یوار سے نکراتی ہوئی!
 دل میں کہتی ہے کہ اس شمع کی لوہی شاید
 ذورِ معبد سے بہت دور چمکتے ہوئے انوار کی تمثیل بنے
 آنے والی سحرِ نویہی قند میل بنے!

— آرزو را ہبھے ہے بے کس و تنہا و حزیں
 ہاں مگر را ہبوں کو اس کی خبر ہو کیونکر
 خود میں کھوئے ہوئے، سبھے ہوئے، سرگوشی سے ڈرتے ہوئے
 را ہبوں کو یہ خبر ہو کیونکر

کس لئے راہب ہے بے کس و تنہا و حزنیں!
 راہب استادہ ہیں مرمر کی سلوں کے مانند
 بیکر اس عجز کی جاں سوختہ ویرانی میں
 جس میں اُگتے نہیں دل سوزی انساں کے گلاں!

راہبہ شمع لئے پھرتی ہے
 یہ سمجھتی ہے کہ اس سے درِ معبد پہ کبھی
 گھاس پر اوس جھلک اٹھے گی
 نگریزوں پہ کوئی چاپ سنائی دے گی!

آنکھیں کا لغم کی

اندھیرے میں یوں چمکیں آنکھیں کا لغم کی
جیسے وہ آیا ہو بھیں بدل کر آ مر کا
آنے والے جابر کا!

سب کے کانوں میں بن ڈالے مکڑی نے جالے
سب کے ہونٹوں پرتالے
سب کے دلوں میں بھالے!

اندھیرے میں یوں چمکے میلے دانت بھی غم کے
جیسے پچھلے دروازے سے آ مر آ دھمکے
سر پر این آدم کے!
غم بھی آمر کے مانند اک دم والا تارا
یا جلتا بحثت اشرارا،
جورستے میں آیا سومارا!

غم گر جابر سا، جیسے آ مر گر جے بر سے
خلقت سہی دبکی تھی اک بہم سے ڈر سے
خلقت نکلی پھر گھر سے!
لبستی والے بول اٹھے! ”اے مالک! اے باری!

کب تک ہم پر ہے گام کا سایہ یوں بھاری،
کب ہو گا فرمائ جاری؟“

وہ حرفِ تہا

[جسے تم نائے وصل معا]

ہمارے اعضا جو آسمان کی طرف دعا کے لئے اٹھے ہیں،

[تم آسمان کی طرف نہ دیکھو]

مقامِ نازک پر ضرب کاری سے جا بچانے کا ہے وسیلہ
کہ اپنی محرومیوں سے چھپنے کا ایک حیلہ؟

بزرگ و برتر خدا کبھی تو [بہشت برحق،]

ہمیں خدا سے نجات دے گا

کہ ہم ہیں اس سرز میں پر جیسے وہ حرفِ تہا،

[مگر وہ ایسا جہاں نہ ہو گا] خموش و گویا،

جو آرزوئے وصالِ معنی میں جی رہا ہو

جو حرفِ معنی کی یک دلی کوترس گیا ہو!

ہمیں معمری کے خواب دے دو

[کہ سب کو بخشیں بقدرِ ذوقِ نگہ تبسم]

ہمیں معمری کی روح کا اضطراب دے دو

[جہاں گناہوں کے حوصلے سے ملے تقدس کے دکھ کا مر ہم]

کہ اُس کی بے نور و تار آنکھیں

دروںِ آدم کی تیرہ راتوں

کو چھیندتی تھیں

اُسی جہاں میں فراق جاں کا ہر فہرست معنی
کو دیکھتی تھیں
بہشت اُس کے لئے وہ معصوم سادہ لوحوں کی عافیت تھا
جہاں وہ ننگے بدن پہ جابر کے تازیانوں سے بچ کے
راہِ فرار پائیں
وہ کفشن پا تھا، کہ جس سے غربت کی ریگ بریاں
سے روزِ فرصت قرار پائیں
کہ صلبِ آدم کی، رحم حوا کی عزلتوں میں
نہایتِ انتظار پائیں!

[بہشت صفرِ عظیم، لیکن ہمیں وہ گم گشته ہند سے ہیں
بغیر جن کے کوئی مساوات کیا بنے گی
وصالِ معنی سے حرف کی بات کیا بنے گی؟]

ہم اس زمیں پر ازال سے پیرانہ سر ہیں، مانا
مگر ابھی تک ہیں دل تو اندا
اور اپنی ثروتی دہ کاریوں کے طفیل دانا
ہمیں معزی کے خواب دے دو

[بہشت میں بھی نشاط، یک رنگ ہو، تو غم ہے
ہوا یک ساجام شہد سب کے لئے تو سم ہے]
کہ ہم ابھی تک ہیں اس جہاں میں وہ حرف تھا
[بہشت رکھلو، ہمیں خود اپنا جواب دے دو!]
جسے تمنا ہے وصلِ معنا۔۔۔۔۔

مسکراہٹیں

مسکراہٹیں ہیں وہ کرم کہ جس کا ریشہ
 اُستوار ازال میں ہے
 اب بھی جس کے ایک ایک پل میں ہے
 کبھی ہیں سہو گفتگو
 کبھی اشارہ خرد، کبھی شرارہ جنوں
 کبھی ہیں راز اندر وہ
 وہ مسکراہٹیں بھی ہیں کہ پارہ ہائے ناں بنیں
 وہ مسکراہٹیں بھی ہیں کہ برگ زرفاش بنیں
 کبودرنگ، زردرنگ، نیلگوں
 کبھی ہیں پیشہ ور کا الہاب خون
 کبھی ہیں رس، کبھی ہیں مے
 کبھی ہیں کارگر کارنگ خ
 کبھی ہیں سنگ رہ
 کبھی ہیں راہ کا نشاں
 کبھی ہیں پشت پاپہ چور بن کے گامز ن
 بھی فریب جستجو،
 کبھی یہی فراقِ لب، کبھی یہی وصالِ جاں
 مگر ہمیشہ سے وہی کرم
 کہ جس کا ریشہ اُستوار ازال میں ہے!

مری مور جاں

مری مور جاں،

مور کم مایہ جاں،

رات بھر زیر دیوار، دیوار کے پاؤں میں

رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی تھی؛

مگر صبح ہونے سے پہلے

انہوں نے جود روازہ کھولا

تو میں مردہ پایا گیا۔۔

[مرے خواب زندہ نپے تھے]

مجھے آنسوؤں کے کرم سے ہمیشہ عداوت رہی ہے

تو میں نے یہ پوچھا: ”عزیزو!

تمہیں اس کا خدشہ نہیں،

کہ میرے زیاں سے، وہ آہنگ حرف و معانی

نمودار ہو گا، مری مور جاں جس کی خاطر

سدار رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی ہے؟

تمہیں اس کا خدشہ نہیں،

کہ یہ خواب بھی،

جو مری موت پر تنشیں رہ گئے ہیں،

جنہیں تم ہزاروں برس تک
 چھپاتے پھر و گے اساطیر کے روز نوں میں
 محبت کے کافور کو چیر کر
 عقیدت کی روئی کے تودوں سے ناگز نکل کر
 عجائب گھروں میں، ہزاروں برس بعد کے
 زائروں کے لئے راحتِ جاں بنیں گے،
 تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہے۔۔۔؟“
 ہے، جیسے یہ بات میں نے
 انہی کے دلوں سے چراں!
 وہ کہنے لگے: ”ہاں یہ خدشہ تو ہے،
 آؤ، اس مرنے والے کو پھر سے جلا دیں
 [مگر اس کے خوابوں کو تابود کر دیں]
 اسے رینگنے دیں
 اسے سالہا سال تک رینگنے دیں
 کہ اس کی نگاہوں میں پھر خواب پیدا نہ ہوں
 اسے رینگنے دیں
 اسے سالہا سال تک رینگنے دیں
 اور آئندہ نسلوں کی جانیں
 غم آگہی سے بچا لیں!

تسلسل کے صحرائیں

تسلسل کے صحرائیں ریگ و ہوا، پاؤں کی چاپ

سمت و صدا

تغیر کا تہائشان:

تسلسل کے صحرائے جاں سوختہ میں

صدا میں بدلتے مہ و سال

ہوا میں گزرتے خدو خال

تہائشانِ فراق و وصال

تسلسل کے صحرائیں

اک ریت ٹیلے کی آہستہ آہستہ ریزش

کسی گھاس کے نامکمل جزیرے میں اک جاں بلب

طاہرِ شب کی لرزش

کسی راہ بھٹکے عرب کی سحر گاہ حمد و شنا

تسلسل کے بے اعتنارات دن میں تغیر کا

تہائشان۔ محبت کا تہائشان!

صبا ہو کر صرصرا کہ باونیم

درختوں کی ٹولیدہ زلفوں میں بازی کناں

اور ذرول کے پتے ہوئے سرخ ہونٹوں

سے بوسہ رہا

جب گزرتی ہے، بیدار ہوتے ہیں اس کی صدا
سے بدلتے ہوئے حادثوں کے نئے سلسلے
نئے حادثے جن کے دم سے تسلی کا روایتیں
نئے حادثے جن کے لطف و کرم کی نہایت نہیں!

تسلی کے صحرا میں میرا گذر کل ہوا

تو یادیں نگاہوں کے آگے گزرتے ہوئے رہندر

بن گئیں:

پھاڑوں پہ پانی کے باریک دھارے

فرازوں سے اترے، بہت دور تک دشتن در

میں محلتے رہے، پھر سمندر کی جانب بڑھے

اور طوفاں بنے،

اُن کی ایک تاریک راتیں سحر بن گئیں!

ازل کے درختوں میں سیبوں کے رسیا

ہمارے جہان دیدہ آبا

درختوں سے اترے، بہت دور تک دشتن در

میں بھکتے رہے، پھر وہ شہروں کی جانب بڑھے

اور انساں بنے، ہر طرف نور باراں بنے

وہ سمت و صداجو سفر

کا نشاں تھیں

وہی منتهاے سفر بن گئیں!

تلسل کے صحرا میں ریگ وہوا، پاؤں کی چاپ

سمت و صدا

تلسل کا راز نہاں، تغیر کا تہاں شاں

محبت کا تہاں شاں

رات خیالوں میں گم

پھول کی پتی نہ ہر، رات کے دل پر ہے بار
رات خیالوں میں گم۔

طاہر جاں پر نہ مار،
رات خیالوں میں گم
کونسی یادوں میں گم ہے شب تاریدہ مو؟
رنج مسافت کا طول؟
[جس کی ہے تو خود رسول!]

وقت کے چہرے کا رنگ؟
جو کبھی قرمز، کبھی زرد، کبھی لا جورد
[تو کہ سیاہی میں فرد
کوری میداں کی مرد!]
راہ کی مہماں سرا؟ [سانس سے پتاں ترے
کیسے ہمکتے رہے]
تاجروں کا قافلہ، ایک نظر باز تھے
حیلوں سے تکتے رہے!
راہ کی مہماں سرا، خوف سے بستر بھی سنگ
وہم سے رویا بھی دنگ
نالہ درویش سے صبح کے پیکر پر ضرب

[ختم تمنا کا کرب]

عشق کا افسانہ گوہرزہ گرمی سے نڈھال
 ظلم کی شاخوں سے ژولیدہ زمانوں کی فال
 حاشیہ مرگ پر ہر دوں کے نشاں
 ریت کے جالوں میں گم
 ریت سوالوں میں گم
 رات خیالوں میں گم!

[سر جواہٹھائے ذرا ہم ترے دعوت منا میں
 جشن ارادت رچائیں!]

کونی یادوں میں گم ہے شب تاریدہ مو؟
 ایک جزیرہ کہیں عیش وفا کا وعدن
 سحر زدہ مردوزن رقص کناں کو بکو
 ننگے بدن، تشنہ جاں!
 کہنے لگے: ”دہ خدا کا ہمیں فرمائیں،
 سر درگوں میں ہو خوں، رقص کریں پھر بھی ہم
 جشن ہے کیوں، کیا خبر؟
 جشن ہے کیوں۔۔۔؟“
 بجھتے گئے سب چراغ، زندہ رہا اک الاوَّ
 جس کی دلک سے زمیں اور ہوئی آتشیں
 اور ہوئی عنبریں!

اور وہ تنہادیا رچاند سے بھی دور دست
 جس میں اذال زیر لب جس میں فعال غم سے پست
 ایک ہی ہو کا کھنڈر، جبری ریارا دبست
 فکر کے مجذوب چپ، حرف کے دیوانے مست
 [تجھ کور ہی نور بھر سطح خدا کی تلاش
 جس کو کوئی چھو سکے: اب تو ہٹا آنکھ سے
 بارِ جہاں کی سلیں!]
 سطح خدا آئندہ اور رُخ نیستی
 محض ہیولائے ہست

رات ذرا سراٹھا، فرش سے چپیدہ تو
 جیسے کنوئیں سے نبات!
 رات ذرا سراٹھا، ہم کہ نہیں دشت صفر
 ہم کہ عدم بھی نہیں!
 سیر تری بے بہا اور ترا ہفت خواں
 تاب میں کم بھی نہیں
 ہاتھ مگر شل ترے، تیرے قدم بھی نہیں
 اور اگر ہوں تو کیا?
 صح کے بلور پر کس کو میسر ثبات?
 رات ذرا سراٹھا
 اور نہ کوتاہ کر اپنی مسافت کی راہ

کیوں ہے خیالوں میں گم؟
کیسے خیالوں میں گم؟

گماں کا ممکن

[جو تو ہے میں ہوں]

(مطبوعہ: نیا ادارہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۶ء)

آگ کے پاس

پیر و اماندہ کوئی

کوٹ پر محنت کی سیاہی کے نشاں
نوجواں بیٹھے کی گردان کی چمک دیکھتا ہوں
[اک رقاہت کی سیلہ بہت تیز
مرے سینہ سوزال سے گزر جاتی ہے]
جس طرح طاق پر رکھے ہوئے گلداں کی
مس و سیم کے کاسنوں کی چمک!
اور گلوائجھے ہوئے تاروں سے بھر جاتا ہے۔۔۔۔

کوئلے آگ میں جلتے ہوئے
کن یادوں کی کس رات میں
جل جاتے ہیں؟
کیا انہی کا نون کی یادوں میں جہاں
سالہا سال یہ آسودہ رہے؟
انہی بے آب درختوں کے وہ جنگل
جنہیں پیرانہ سری بار ہوئی جاتی تھی؟
کوئلے لاکھوں برس دُور کے خوابوں میں الجھ جاتے ہیں۔۔۔۔

آج شب بھی وہ بڑی دیر سے

گھر لوٹا ہے

اُس کے الفاظ کو

ان رنگوں سے، آوازوں سے کیا ربط

جو اس غم زدہ گھر کے خس و خاشک میں ہیں؟

اُس کو اس میز پر بکھری ہوئی

خوبصورت کے جنگل سے غرض؟

آج بھی اپنے عقیدے پر بدستور

بضدقائم ہے!

وہ درختوں کے تنومند تھے

[اپنے آئندہ کے خوابوں میں اسیر]

گرد باد آہی گئے

ان کی رہائی کا وسیلہ بن کر

خود سے مجبوری ناگاہ کا حیله بن کر

آئے اور چل بھی دیے

طول المناک کی دہنیز پر

”رخصت“ کہہ کر

اور وہ لاکھوں برس سوچ میں

آئندہ کے موہوم میں خوابیدہ رہے!

میرے بیٹے، تجھے کچھ یاد بھی ہے

میں نے بھی شور مچایا تھا بھی
 خاک کے بگڑے ہوئے چہرے کے خلاف؟
 لمحن بے رنگِ ہوا سن کے
 مری جاں بھی پکارا تھی تھی؟
 میں کبھی ایک انداز کے بھی دو کا سہارا لیتا
 اپنی ساتھی سے میں کہہ اٹھتا کہ ”جاگو، اے جان!
 ہر انداز تیرہ بیاباں میں
 بھٹکتے ہوئے پتوں کا ہجوم!
 میراڈر مجھ کو نگل جائے گا۔۔۔۔۔“
 میرے کانوں میں مرے کرب کی آواز
 پلٹ آتی تھی:
 ”جھے بے کار خداوں پہ یقین
 اب بھی نہیں؟
 اب بھی نہیں؟“

 آج بھی اپنے ہی الحاد کی کرسی میں
 پڑا اونگتا ہوں
 نوجوان بیٹے کے الفاظ پہ چونک اٹھتا ہوں:
 ”تونے، بیٹے،
 یہ عجب خواب سنایا ہے مجھے
 اپنا یہ خواب کسی اور سے ہرگز نہ کہو!“

کبھی آہتہ سے دروازہ جو کھلتا ہے تو ہنس دیتا ہوں

-- یہ بھی اس رات کی صرسری

نئی چال، نیاد ھوکا ہے!

”پھول یا پریاں بنانے کا کوئی نسخہ

مرے پاس نہیں ہے میئے

مجھے فرداؤں کے صحراء سے بھی

افسوں روایت کی لہک آتی ہے۔۔۔۔۔

آگ میں کوئلے بھختے کی تمنانہ کرو

ان سے آیندہ کے مٹتے ہوئے آثار

ابھرا آئیں گے

ان گزرتے ہوئے لمحات کی تہائی میں۔۔۔۔۔

کیسا یہ خواب سنایا ہے مجھے تو نے ابھی

نہیں، ہر ایک سے،

ہر ایک سے یہ خواب کھو

اس سے جاگ اٹھا ہے

سویا ہوا مجدوب

مری آگ کے پاس

ایسے مجدوب کو اک خواب بہت

خواب بہت۔۔۔ خواب بہت۔۔۔۔۔

ایسے ہر مست کو

اک خواب بہت!

یہ خلا پُر نہ ہوا

ذہن خالی ہے

خلانور سے، یا نغمے سے

یا نکہتِ گم راہ سے بھی

پُر نہ ہوا

ذہن خالی ہئی رہا

یہ خلا حرفِ تسلی سے،

تبسم سے،

کسی آہ سے بھی پُر نہ ہوا

اک نفی لرزشِ پیغم میں سبھی

جهد بے کار کے ماتم میں سبھی

ہم جونا رس بھی ہیں، غم دیدہ بھی ہیں

اس خلا کو

[اسی دہلیز پر سوئے ہوئے

سرمست گدا کے مانند]

کسی مینار کی تصویر سے،

یارِ نگ کی جھنکار سے،

یا خوابوں کی خوشبوؤں سے

پڑ کیوں نہ کریں؟

کہ اجل ہم سے بہت دور
بہت دور رہے؟

نہیں، ہم جانتے ہیں
ہم جو نارس بھی ہیں، غم دیدہ بھی ہیں
جانتے ہیں کہ خلا ہے وہ جسے موت نہیں
کس لئے نور سے، یا نگے سے
یا حرفِ تسلی سے اسے "جسم" بنائیں
اور پھر موت کی وارفتہ پذیرائی کریں؟
نئے ہنگاموں کی تحلیل کا در باز کریں
صحیح تکمیل کا آغاز کریں؟

بے سُر االاپ

وہ صحیح جن سے پلت گئی تھی

دھنک کی خوبیو

وہاں ابھی تک درخت اپنی بڑنگی میں

پکارتے ہیں۔۔۔

پکارتے ہیں

۔۔۔ ”دھنک کی خوبیو

وہ خواب لادے

کہ جن سے بھر جائیں رات بھر میں

سبو ہمارے۔۔۔

وہ چاند کل شب

جسے ہم اپنے دلوں کے پیالوں

میں قطرہ قطرہ

انڈیلتے رہ گئے تھے، اس کو

ہنسی ہنسی میں

ابھی کوئی شخص لمحہ پہلے،

چڑھا کے پیالہ پٹک گیا ہے۔۔۔

یہ دیکھتے ہی

گلی کاملہ بہت ہی رویا:
”خلا سے کچھ عرش کی خبر بھی؟“

[نفی میں کیسے نفی کا جویا]

”وہ چاند کے آر پار ۔۔۔ گویا ۔۔۔
کہیں نہیں تھا؟“

عجیب! گویا کہیں نہیں تھا!“

وہ صحن جن سے پلت گئی ہے
دھنک کی خوبیو

وہ ان میں فرد اکی نار سائی کے اشک

چپ چاپ بورہ ہے ۔۔۔

وہ ہنس رہا ہے:
”اگر ز میں گھومتی ہے، کیونکر
یہ لوگ صحنوں کو لوٹ آئے سحر سے پہلے
کوئی پرندہ نہ راہ بھو لاسفر سے پہلے؟“

وہ صحن جن سے پلت گئی تھی

دھنک کی خوبیو

خلا سے آتی ہوئی صدائیں

اب اُن کے دیوار دبام کو

تھپتھپا رہی ہیں،

ہمارے بوڑھے نزار چہروں پر لطمہ زن ہیں

کہ رات کے دل فریب روئیا

ہمارے سینوں میں

بے سر اسا الاپ بن کر

ائٹک گئے ہیں!

مریل گدھے

تلاش--- کہنہ، گر سند پیکر

برہنہ، آوارہ رہگزاروں میں پھرنے والی

تلاش--- مریل گدھے کے مانند

کس در تپے سے آگئی ہے؟

غموں کے برفان میں بھٹک کر

تلاش زخمی ہے

رات کے دل پر اُس کی دستک

بہت ہی بے جان پڑ رہی ہے

] گدھے بہت ہیں کہ جن کی آنکھوں

میں برف گالے لرز رہے ہیں [

ہوا کے ہاتھوں میں تازیانہ

تمام عشقوں کو راستے سے

[تلاش کو بھی]

بھگارہی ہے

[تلاش کو عشق کہہ رہی ہے !]

یہ رات ایسی ہے

حرف جس میں ابوں سے نکلیں

تو برف بن کر

وہ برف پارے کہ جن کے اندر
ہزار پتھرائی ہجر راتیں،
ہزار پتھرائی ہجر راتوں کے بکھرے پتھر
دبے ہوئے ہوں۔۔۔۔

[تلائش کیا کہہ رہی ہے؟
دیکھو، مری کہانی میں رات کے تین نجع پکے ہیں
اگر میں بے وزن ہو چکی ہوں۔۔۔۔

اگر میں مریل گدھا ہوں
مجھ کو معاف کر دو۔۔۔۔۔
تلائش ہی وہی ازل سے بوڑھا گدھا نہیں ہے
دھکیل کر جس کو برف گالے
گھروں کے دیوار و در کے نیچے
لٹا رہے ہیں۔۔۔۔۔

گدھے بہت ہیں جہاں میں: [ماضی سے آنے والے
جہاز کا انتظار مثلاً۔۔۔۔۔]
[اور ایسے مثلاً میں ثائے ساکن]
یہ اجتماعی حکایتیں، ایتیں، کشاکش،
یہ داڑھیوں کا، یہ گیسوؤں کا ہجوم مثلاً۔۔۔۔۔
یہ اؤں کی گدھوں کی عفت پہنکتے چینی۔۔۔۔۔
یہ بے سرے راگ ناقدوں کے۔۔۔۔۔

یہ بے یقینی ۔۔۔

یہ نگی را نہیں، یہ عشق بازی کی دھوم مثلاً ۔۔۔

تمام مریل گدھے ۔۔۔

[مریل گدھے نہیں کیا؟]

دریچہ کھولو

کہ برف کی لے

نئے تو انا گدھوں کی آواز

ساتھ لائے

تمہاری روحوں کے چیتھڑوں کو سفید کر دے!

یارانِ سرپُل

انہوںیوں کے خواب سے،
 انہوںیوں کے مرحلہ ناب سے
 جاگے ہوئے کچھ لوگ
 اب ہوںیوں کے پُل پر کھڑے کا نپتے ہیں،
 کندھوں پر اٹھائے ہوئے نعروں کے بیاباں۔۔۔
 اک گونج ابھی ان کے تعاقب میں ہے
 یہ جس سے ہیں ہر دم رزاں۔۔۔
 [کیا یہ ہے سزا ان کی
 جوز یہاں کو،
 یا نور کو،
 یا ہست کی داراں کو
 بر باد کریں؟]
 ہم کیسے سزا یافتہ ہیں!

ان لوگوں میں اک میں بھی ہوں
 میں ان کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں
 ٹوٹے ہوئے اس پُل سے لگے دوستو
 ہم کیسے سزا یافتہ ہیں؟

ہاں، آؤ کہ پھر

حافظے کے بجھتے الاو میں تلاشیں

وہ زخم کہ جو رس نہ سکے تھے

پھر پل کے کنہرے سے لگے

اپنے گناہوں کی صدائیں ناپیں

دریا کے سیدھا جھاگ میں

دیکھی تھیں کبھی تیرتی لاشیں

اب اپنے وجودوں کے حبابوں کو بکھرتا پائیں ۔۔۔

ہم کیسے سزا یافتہ ہیں!

اے پل سے لگے دوستو

تم ہرزہ سرائی کی بلندی سے چلانے کے تھے

مگر حیف

کھل پائے نہ صرصر میں تمہارے چھاتے

[بے چارگی برگ جو آغوش ہوا میں رہ جائے]

اتنانہ ہوا اپنی خبر ہی لا تے!

ہم چُپ ہیں مگر

لغظہ میں بول رہے ہیں ۔۔۔

الفاظ یہ کہتے ہیں:

”سرابوں کی تپش پیتے رہے ہو

شبِ نم کی ہوں جیتے رہے ہو
 صحراء کا ب شبِ نم کے خواب دکھاؤ!“
 مانا کہ کسی نے وہ تنہ پھینکا ہے پل پر
 گم جس سے ہے آئندہ کا پرتو ہم سے
 پھیلے ہوئے لمحوں میں الجھ جانے کا ذر ہے۔۔۔۔۔
 [اک وقت ہے لیکن
 جوا بھی زندہ ہے
 سایوں کی طرح مردہ نہیں ہے]
 ہاں لفظ ہمیں بول رہے ہیں
 گزری ہوئی تاریخیں کبھی یاددالاتے ہیں
 کبھی راہ میں بُھرے ہوئے
 سب نقطے لکیریں
 یہ لفظ ہیں، اُس وقت کے بارے میں بھی جانتے ہیں
 جو ایک ہے اور جس کا کوئی نام نہیں ہے!

خورشید کہ نومید تھا
 گھر لوث گیا تھا
 اب اپنے طلوعوں کی ذکاوت کو
 [کہ جس سے ہیں یہ تاب
 ہمارے چہرے]
 پھر ہم سے بُھپالے نہیں

یہ ہو نہیں سکتا

اے دوستو!

اب آؤ کہ اس پل پر کھڑے
پاؤں میں بے مہری کی زنجیریں
کہیں سخت نہ ہو جائیں!

بس آؤ

کہ پھر شہر کو لوٹیں
کہتے ہیں کہ ہر شعرو ہیں نغمہ و ہیں ہے
انہو نیاں پھر راستہ کا ٹیکنے نہیں
یہ ہو نہیں سکتا!

اے شہر! ہم آئے

فانوسوں کے، میلوں کے،
جو اس میوہ فروشوں کے
جو اس شہر

اے ہست کے صحنوں میں
نئے سجدہ گزاروں کے
جهاں شہر
اے میری اذال شہر!

بات کر

بات کر مجھ سے

مجھے چہرہ دکھا میرا کہ ہے
تیری آنکھوں کی تمازت ہی سے دھھلا ہوا

بات کر مجھ سے

مرے رُخ سے ہٹا پر دہ
کہ جس پر ہے رپا کاری کے رنگوں کی دھنک
پھیلی ہوئی

وہ دھنک جو آرزومندی کا آئینہ نہیں
بامدادِ شوق کا زینہ نہیں!

تو نے دیکھا تھا کہ کل میں [اک گداگر]
صحیح کی دیوار کے سائے تلے
خھڑرا ہوا پایا گیا۔۔۔۔۔

تیری آنکھیں، تیرے لب سکتے رہے
ان کی گرمی پر یقین کیے مجھے آتا کہ میں
اپنے دل کے حادثوں کی تہہ میں تھا
یادوں سے غزل ایا ہوا!

بات کر مجھ سے
 کہ اب شب کے سحر بننے میں
 کوئی فاصلہ باقی نہیں

 بات کر مجھ سے کہ تیری بات
 خطِ نخ ہو بر رونے مرگ
 اب اُتر جا چشم و گوش و لب کے پار
 اُجزے شہروں کی گذر گا ہوں پا
 آوازوں کی قند میں اتار

 راز کی لہریں
 اُبھر آئیں قطار اندر قطار!

رات شیطانی گئی

رات شیطانی گئی۔۔۔

ہاں مگر تم مجھ کو الجھاؤ نہیں

میں نے کچل ڈالے ہیں کتنے خوف

ان پا کیزہ رانوں کے تلے

[کر رہا ہوں عشق سے دھوئی ہوئی]

رانوں کی بات]

رات شیطانی گئی تو کیا ہوا؟

لا و، جو کچھ بھی ہے لا و

یہ نہ پوچھو

راستہ کے گھونٹ باقی ہے ابھی

آج اپنے مختصر لمحے میں اپنے اُس خدا کو

رو برو لا میں گے ہم

اپنے ان ہاتھوں سے جوڑھا لا گیا۔۔۔

آج آمادہ ہیں پی ڈالیں لہو۔۔۔

اپنا ہو۔۔۔

تا بکے اپنے لہو کی کم روائی تا بکے؟

سادگی کو ہم کہیں گے پارسائی تا بکے؟

دست دلب کی نارسائی تا بکے؟

لاو، جو کچھ بھی ہے لاو
 رات شیطانی گئی تو کیا ہوا؟
 صوت ورنگ دنور کا وہ رجز گاؤ
 جو بھی گاتے تھے تم
 رات کے جرے سے نکلو
 اور اذا نوں کی صدائے کی فرصت دو ہمیں۔۔۔۔۔
 رات کے اس آخری قطرے سے جو ابھری ہیں
 ان بھری اذا نوں کی صدا۔۔۔۔۔
 رات۔۔۔۔۔ شیطانی گئی تو کیا ہوا؟

کلام نہیں رہا

کلام نہیں رہا

کلام کس طرح بنے؟

ہمارے ان پٹے ہوئے اطیغوں پر جو ہم اسے

شانچکے ہیں بارہا

کلام کس طرح بنے؟

کلام اب پکھل رہا ہے رفتہ رفتہ

ان دلوں کی شمع کی طرح

جو جل چکے جلا چکے۔۔۔۔۔

کلام جس کا ذکر کر رہے ہیں ہم

عجیب بات ہے کلام بھی نہیں!

مگر اسے کلام کے سوا کہیں تو کیا کہیں؟

کہ اس کا اور کوئی نام بھی نہیں!

ہم اس پر کچھ فدا نہیں مگر اسے

جور د کریں تو کیوں کریں؟

کہ یہ ہمارے جسم و جاں کو پاتارہا

ہمارے ذہن و دل کو سالہا سے ڈھالتا رہا۔۔۔۔۔

یا اب بھی ڈھالتا ہے اور ڈھالتا رہے گا

اور ہم یہ چاہتے بھی ہیں!

کلام ایک قرب ہے،
ہمیشہ بعد کو پکارتار ہا۔۔۔

سمندروں کو دیکھتے ہوتم
وہ کس طرح سمندروں کے بعد کو پکارتے ہیں رات دن؟
اسی لئے صدائے مرگ
سن کے اپنے باطنِ نحیف میں
ہم آپ کرائھے ہیں پھر سے ہستِ نوکی آرزو۔۔۔

وہ رات جو بھی سیاہ جنگلوں کو۔۔۔
جنگلوں کی آنکھاں سے چھپی ہوئی
مہورتوں کو چاٹتی رہی
وہ اب دلوں کو چاٹتی ہے، ان دلوں
کو جن میں پھر سے جاگ آئی
حیاتِ نوکی آرزو۔۔۔

وہ رات جس کے چاؤشوں نے دیکھ پائے
وہشی قدیم کے نشان پا
جو شرق و غرب میں نکل پڑا ہے
چور کی دلاوری لئے۔۔۔
ہم اپنے ماضی قریب کو مٹا تو دیں

--- مٹانا چاہتے بھی ہیں مگر ---

یہ دیکھتے ہوت
خفیف سی صد اُٹھی، وہ ہائپنے لگا
وہ خوف ہانکنے لگا
وہ اپنے ناخنوں کے جنگلوں سے
ہم کو جھانکنے لگا؟

وہ رات جو سیاہ جنگلوں کو چاٹتی رہی
وہ آج ہم پایے آئی ہے کہ جیسے آئے رات
کمنوں پہ جو کسی بڑے فرج میں ناگہاں
اسیر ہو کے رہ گئے!

ہم آدمی کو پھر سے زندہ کر سکیں گے کیا؟

---- مگر وہ مر جائے
فسانہ و فسوں کے صد ہزار مر جائے
جوراہ میں پھر آئیں گے؟

تابہی! یہ بتا کہ اور مر جائے بھی ہے
کہ جس کو پار کر سکے گا آدمی؟
وہ دیکھو شی قدم جو لہو سے
سوچتا رہا سدا
پھر آج رنگ و نور سے الجھ پڑا ----

۱۰۸
اُسی کا نغمہ ہے

جوں رہے ہیں ریڈ یو سے ہم

دھرم دھما دھما دھما دھرم۔۔۔۔۔

بنا وہ راستہ کہاں ہے جس سے پھر

جنوں کے خواب،

یا خرد کے خواب،

یا سکون کے خواب

لوٹ آئیں گے

بنا وہ راستہ کہاں؟

نیا آدمی

نو اور سازِ طرب۔۔۔۔

یہ سازِ طرب میں نوائے تمنا
نوائے تمنا پہ کوچے کے لڑکوں کے پتھر
یہ پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سرور

نئی آگ، دل

دل ناتواں کی نئی آگ سب کا سرور

نئی آگ سب سے مقدس ہمیں
ہم اس آگ کو کس کی آنکھوں کے معبد
پہ جا کر چڑھائیں؟

نئی آگ کے کس کو معنی بجھائیں؟

نئی آگ ہر چشم دلب کا سرور

نئی آگ سب کا سرور

روایت، جنازہ

خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا

جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے

گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب

ریا کار لوگوں کو شور و شغب کا سرور

نئے آدمی کا نزول

اور اس پر غصب کا سرور

نئے آدمی کی اس آمد سے پہلے

مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں

[زمانے کی بارش میں بھیکے ہوئے بھیڑیے!]

نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی

اور اس پر پرانے نئے بھیڑیوں کی فغاں

فغاں کا غصب اور غصب کا سرور

نئے آدمی کا ادب

ادب اور نیا آدمی

نئے آدمی کو طلب کا سرور

نئے آدمی کے گماں بھی یقین

گماں جن کا پایاں نہیں ---

گمانوں میں دانش

برہنہ درختوں میں با دیسم

برہنہ درختوں کے دل چیرتی ---

نئے آدمی کا ادب

اور نئے آدمی کو ادب کا سرور

زنجبیل کے آدمی

مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے لہو کی بو
 کبھی ذبح خانے کی تیز بو
 کبھی عورتوں کی ابلتی لاشوں کی تیز بو
 کبھی مر گھٹوں میں کباب ہوتے ہوئے سروں کی
 دبیز بو

وہ دبیز ایسی کہ آپ چاہیں تو
 تنخ تیز سے کاٹ دیں

مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے لہو کی بو،
 کہ مجھی کو قتل کیا ہو جیسے کسی نے
 شہر کے چوک میں!

یہی چوک تھا۔۔۔۔۔

یہی وہ مقام تھا، ناگہاں
 کسی خوف سے میں جسد سے اپنے پٹ گیا
 کہیں تھا بھی میرا جسد مگر؟]
 مرے آنسوؤں کی لڑی زمیں پہ بکھر گئی
 مری ”ہیک ہیک“ نہ قسم سکی۔۔۔۔۔
 کبھی سائے آ کے سکڑ گئے

کبھی اور بڑھتے چلے گئے
 کہ وہ اپنے جبر کے مخوروں کے سوانح تھے
 کسی اور راہ سے باخبر!
 مری سکیاں کسی بے صدائی کے ناگہاں میں
 اُتر گئیں۔۔۔۔۔

ابھی چاند دفن تھا بادلوں کے مزار میں
 وہیں میں نے نفس فریب کار کا سر، بدن
 سے اڑا دیا
 وہیں میں نے اپنی خودی کی پیرہ زنِ خمیدہ کمر
 کی جان دبو جلی۔۔۔۔۔

وہ کوئی برہنہ دمرگ رنگ صد اتحی
 جس کا سراغ پا کے میں چل پڑا۔۔۔۔۔

وہ صد اجو مخڑہ پن میں مجھ سے کبیر تر
 کسی فلنے میں رچی ہوئی وہ چڑیل۔۔۔۔۔

احمق و تندخو۔۔۔۔۔

نئے ریگ زاروں میں فاتحوں کے جہاں پیر میں
 گھومتی ہوئی سوبہ سو
 نئے استخوانوں کے آستانوں کی راہ جو۔۔۔۔۔

[سرینوں کو ڈھانپو کہ ان پر ابھی زندگی کی لکد کوب کے، ان ہزاروں برس کے نشاں
ہیں جو گذرے نہیں ہیں کہ ننگے سرینوں کی دعوت سے پڑتے رہے ہیں، ہمیشہ سے
ان پر روایات کے بعد کے تازیا نے اور ان کے سوا ان جواں ترکیلے دماغوں کی
کرنوں کے نیزے، جو معقول و منقول دونوں سے خود کو الگ کرچے ہیں؛ سرینوں کو
ڈھانپو کہ اب تک وہ کو دن بھی موجود ہیں جن کا ای ماں ہے غوغاء و کشتار و امرد پرستی سے
وہ بادشاہت ملے گی کہ جس کو وہ برپا کرنے میں مختار ہوں گے؛ یہ وہ لوگ ہیں جن کی
جنت کے الٹے چھپر کھٹ میں کابوس کی مکڑیاں ان کی محرومیاں بُن رہی ہیں، وہ جنت
کہ جس میں کسالت کے دن رات نعروں کی رونق سے زندہ رہیں گے۔۔۔]

کئی بار میں نے۔۔۔ نکل کے چوک سے۔۔۔ سمعی کی
کہ میں اپنی بھوتوں کی میلی وردی اتار دوں
نئے بولتے ہوئے آدمی کے نئے الام میں شریک ہوں
میں اُسی کے حسن میں، اُس کے فن میں، اُسی کے دم میں
شریک ہوں

میں اُسی کے خوابوں، اُنہی کے معنی تہہ بہ تہہ میں
اُنہی کے بڑھتے ہوئے کرم میں شریک ہوں۔۔۔

وہ تمام چوہے۔۔۔ وہ شاہ دولت کے ارجمند۔۔۔

ہر ایک بارا چھل پڑے۔۔۔ مرے خوف سے
مرے جسم و جاں پہ اُبل پڑے

تو عجیب بات ہے میں اگر

ہمہ تن نشاٹ اغور ہوں؟

شبِ انتقام کی آگ میں ہوں جلا ہوا؟

کہ فنا پرست کدورتوں میں رچا ہوا؟

سنو! جنگ جو وہ سپا ہیو

مری آرزو کی شرافتوں کو دعائے دو

میں لڑھک کے دامنِ کوہ تک جو پہنچ گیا

تو یہ ڈر ہے۔۔۔۔۔

زندہ چبانہ لوں میں تمہیں۔۔۔۔۔ کہ تم

ہوتا مام ”شیرہ زبیل کے آدمی!“

مری بے بسی پہنچو گے تم تو ہنسا کرو۔۔۔۔۔

میں دعا کروں گا:

خدا یے رنگ و صد اونور

تو ان کے حال پر حم کر

[خدا،

رنگِ نو، نور و آوازِ نو کے خدا!

خدا،

و حدت آب کے عظمتِ باد کے

رازِ نو کے خدا!

قلم کے خدا، سازِ نو کے خدا

تبسم کے اعجازِ نو کے خدا۔۔۔۔۔

دوئی کی آبنا

ہمیں ہیں وہ کہ جن کی اک نگاہ سے
صداد دوئی کی آبنا کے آر پار اتر گئی

وہ عشق جس کی عمر
آدمی سے بھی طویل تر
وہ محض اشتہان نہیں
وہ محض کھیل بھی نہیں
وہ آب و نان کا رکا ہوا سوال بھی نہیں
وہ اپنے ہی وجود کا حسد نہیں
جوموت نے بچھار کھا ہوا یہا
ناگزیر جال بھی نہیں
یہا،
جو حادثے کے لائے دگل سے یا
نصیب کے غبار سے نہیں اٹھے
ازل کے حافظے کے درد سے اٹھے
جو ہوش کے شگاف سے ۔۔۔
جو استوائے جسم و روح سے اٹھے ۔۔۔
ہمیں ہیں وہ کہ جن کی اک نگاہ سے

صدادوئی کی آبنا کے آرپارا تر گئی
 اور اس صدا سے ایک ایسا مرحلہ برس پڑا
 جو بے نیاز بعد تھا
 جو مشرقِ وجود تھا
 وہ مرحلہ برس پڑا!

ہماری ایک جرأت نگاہ سے
 تمام لوگ جاگ اٹھے
 صدا کی شمع ہاتھ میں لیے ہوئے
 دوئی کی آبنا کے آرپارڈ ہونڈنے لگے
 اُسی طلوع کی خبر
 جو وقت کی نئی کرن کے پھوٹتے ہی
 ساحلِ نمود پر
 کم التفات انگلیوں کے درمیان پھسل گیا!

صد اپکارتی ہے پھر
 وہی طلوع جس کو روچکے تھے تم
 ابھی ابھی
 دوئی کی آبنا کے ساحلوں کی مرگ ریت پر
 جھلک اٹھا

گماں کا ممکن۔۔ جو تو ہے میں ہوں!

کریم سورج،

جو ٹھنڈے پھر کو اپنی گولائی

دے رہا ہے

جو اپنی ہمواری دے رہا ہے۔۔۔

[وہ ٹھنڈا پھر جو میرے مانند

بھورے بزروں میں

دوسری گیک وہ واکی یادوں میں لوٹتا ہے]

جو بہتے پانی کو اپنی دریادلی کی

سرشاری دے رہا ہے

۔۔۔ وہی مجھے جانتا نہیں

مگر مجھی کو یہ وہم شاید

کہ آپ اپنا ثبوت اپنا جواب ہوں میں!

مجھے وہ پہچانتا نہیں ہے

کہ میری دھیمی صدا

زمانے کی جیل کے دوسرے کنارے

سے آرہی ہے

یہ جیل وہ ہے کہ جس کے اوپر

ہزاروں انساں

افق کے متوازی چل رہے ہیں

افق کے متوازی چلنے والوں کو پارلاتی ہیں

وقت لہریں ۔۔۔

جنہیں تمنا، مگر، سماںی خرام کی ہو

انہی کو پاتال زمزموں کی صد انسانی ہیں

وقت لہریں

انہیں ڈبوتی ہیں وقت لہریں!

بتمام ملاح اس صدائے سدا ہر اس اس، سدا اگر زیاد

کہ جھیل میں اک عمود کا چور چھپ کے بیٹھا ہے

اس کے گیسو افق کی چھت سے لٹک رہے ہیں ۔۔۔

پکارتا ہے: ”اب آؤ، آؤ!

ازل سے میں منتظر تمہارا ۔۔۔

میں گنبدوں کے تمام رازوں کو جانتا ہوں

درخت، مینار، برج، زینے، مرے، ہی ساتھی

مرے، ہی متوازی چل رہے ہیں

میں ہر ہوائی جہاز کا آخری بیسرا

سمندروں پر جہاز رانوں کا میں کنارا

اب آؤ، آؤ!

تمہارے جیسے کئی فسانوں کو میں نے ان کے

”ابد کے آغوش میں اتارا۔“

تمام ملاح اس کی آواز سے گریزاں
افق کی شاہراہِ مبتدل پر تمام سہے ہوئے خراماں---

مگر سماوی خرام والے

جو پست و بالا کے آستاں پر جئے ہوئے ہیں
عمود کے اس طناب ہی سے اتر رہے ہیں
اسی کو تھامے ہوئے بلندی پر چڑھ رہے ہیں!

اسی طرح میں بھی ساتھ ان کے اُتر گیا ہوں
اور ایسے ساحل پر آ لگا ہوں
جہاں خدا کے نشانِ پانے پناہی ہے
جہاں خدا کی ضعیف آنکھیں
ابھی سلامت پچی ہوئی ہیں
یہی سماوی خرام میرا نصیب نکلا
یہی سماوی خرام جو میری آرزو تھا۔۔

مگر نجانے

وہ راستہ کیوں چنا تھا میں نے
کہ جس پر خود سے وصال تک کا گماں نہیں ہے؟
وہ راستہ کیوں چنا تھا میں نے
جور ک گیا ہے دلوں کے ابہام کے کنارے؟
وہی کنارا کہ جس کے آگے گماں کا ممکن

جو تو ہے میں ہوں!

مگر یہ چج ہے،

میں تجھ کو پانے کی [خود کو پانے کی] آرزو میں

نکل پڑا تھا

اُس ایک ممکن کی جستجو میں

جو تو ہے میں ہوں

میں ایسے چہرے کو ڈھونڈتا تھا

جو تو ہے میں ہوں

میں ایسی تصویر کے تعاقب میں گھومتا تھا

جو تو ہے میں ہوں!

میں اس تعاقب میں

کتنے آغازگر چکا ہوں

[میں اس سے ڈرتا ہوں جو یہ کہتا

ہے مجھ کو اب کوئی ڈر نہیں ہے]

میں اس تعاقب میں کتنی لگیوں سے

کتنے چوکوں سے

کتنے گونگے مجسموں سے، گزر گیا ہوں

میں اس تعاقب میں کتنے باغوں سے

کتنی اندر ہی شراب راتوں سے،

کتنی بانہوں سے،

کتنی چاہت کے کتنے بھرے سمندروں سے
 گزر گیا ہوں
 میں کتنی ہوش عمل کی شمعوں سے،
 کتنے ایماں کے گنبدوں سے
 گزر گیا ہوں
 میں اس تعاقب میں کتنے آغاز کتنے انجام گئے چکا ہوں۔۔۔
 اب اس تعاقب میں کوئی در ہے
 نہ کوئی آتا ہوا زمانہ
 ہر ایک منزل جورہ گئی ہے
 فقط گزرتا ہوا فسانہ
 تمام رستے، تمام بوجھے سوال، بے وزن ہو چکے ہیں
 جواب، تاریخ روپ دھارے
 بس اپنی تکرار کر رہے ہیں۔۔۔
 ”جواب ہم ہیں۔۔۔ جواب ہم ہیں۔۔۔
 ہمیں یقین ہے جواب ہم ہیں۔۔۔“
 یقین کو کیسے یقین سے دھار رہے ہیں کیسے!
 مگر وہ سب آپ اپنی ضد ہیں
 تمام جیسے گماں کا ممکن
 جو تو ہے میں ہوں!

تمام گندے [تو جانتی ہے]

جو سطح دریا پہ ساتھ دریا کے تیرتے ہیں
 یہ جانتے ہیں یہ حادثہ ہے،
 کہ جس سے ان کو
 [کسی کو] کوئی مفر نہیں ہے
 تمام گندے جو سطح دریا پہ تیرتے ہیں
 نہنگ بننا۔۔۔۔ یہ ان کی تقدیر میں نہیں ہے
 [نہنگ کی ابتداء میں ہے اک نہنگ شامل
 نہنگ کا دل نہنگ کا دل]
 نہ ان کی تقدیر میں ہے پھر سے درخت بننا
 [درخت کی ابتداء میں ہے اک درخت شامل
 درخت کا دل درخت کا دل]
 تمام گندوں کے سامنے بندواپسی کی
 تمام را ہیں
 وہ سطح دریا پہ جبر دریا سے تیرتے ہیں
 اب ان کا انجام گھاث ہیں جو
 سدا سے آغوش دا کیے ہیں
 اب ان کا انجام وہ سفینے
 ابھی نہیں جو سفینے گر کے قیاس میں بھی
 اب ان کا انجام
 ایسے اور اق جن پر حرف یہ چھپے گا
 اب ان کا انجام وہ کتابیں۔۔۔۔

کہ جن کے قاری نہیں، نہ ہوں گے

اب ان کا انجام ایسے صورت گروں کے پر دے

ابھی نہیں جن کے کوئی چہرے

کہ ان پا آنسو کے رنگ اتریں،

اور ان میں آیندہ

ان کے روایا کے نقش بھردے!

غیریب گندوں کے سامنے بندواپسی کی

تمام را ہیں

بقائے موهوم کے جو رستے کھلے ہیں اب تک

ہے ان کے آگے گماں کا ممکن۔۔۔

گماں کا ممکن، جو تو ہے، میں ہوں!

جو تو ہے، میں ہوں!

حسن کوزہ گر (۸)

جہاں زاد، کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہرِ مدفون کی ہرگلی میں
مرے جام و مینا و گلدال کے ریزے ملے ہیں
کہ جیسے وہ اس شہر برپا د کا حافظہ ہوں!

[خُن نام کا اک جواں کوزہ گر--- اک نئے شہر میں ---
اپنے کوزے بناتا ہوا، عشق کرتا ہوا
اپنے ماضی کے تاروں میں ہم سے پرواگیا ہے
ہمیں میں [کہ جیسے ہمیں ہوں] سموایا گیا ہے
کہ ہم تم وہ بارش کے قطرے تھے جورات بھرنے،
[ہزاروں برس رینگتی رات بھر]
اک در تچ کے شیشوں پر گرتے ہوئے سانپ لہریں
بناتے رہے ہیں،
اور اب اس جگہ وقت کی صبح ہونے سے پہلے
یہ ہم اور یہ نوجواں کوزہ گر
ایک روایا میں پھر سے پردئے گئے ہیں!]

جہاں زاد،

یہ کیسا کہنہ پرستوں کا انبوہ
کوزوں کی لاشوں میں اتراء ہے
دیکھو!

یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں
کبھی جام و میتا کی لمب تک نہ پہنچیں
یہی آج اس رنگ و رعن کی مخلوق بے جاں
کو پھر سے اُلنے پلنے لگے ہیں
یہ ان کے تلے غم کی چنگاریاں پا سکیں گے
جو تاریخ کو کھا گئی تھیں؟
وہ طوفان، وہ آندھیاں پا سکیں گے
جو ہر چیخ کو کھا گئی تھیں؟

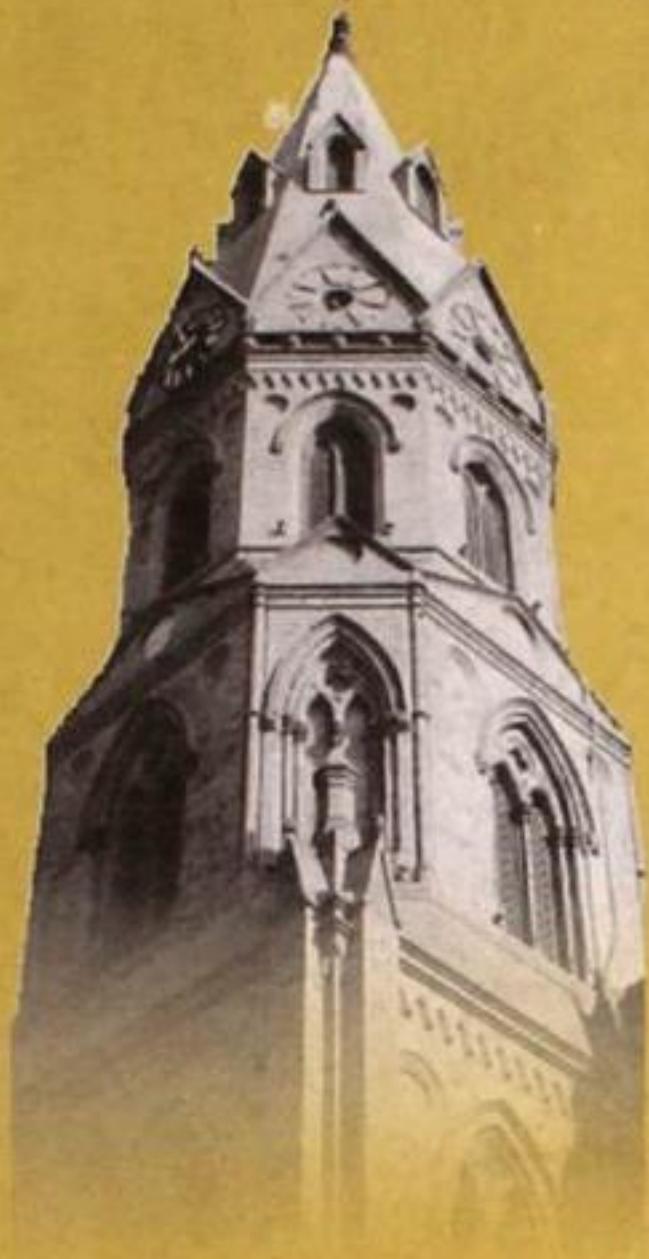
انہیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے۔۔۔
[مرے اور اس نوجوان کو زہر کے؟]
انہیں کیا خبر کون سی تیلوں کے پروں سے؟
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے؟
کون سی ذات سے، کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اتارے؟
یہ سب لوگ اپنے اسی روں میں ہیں
زمانہ، جہاں زاد، افسوں زدہ برج ہے
اور یہ لوگ اُس کے اسی روں میں ہیں۔۔۔

جواں کو زہ گر نہیں رہا ہے!
 یہ محصوم وحشی کہ اپنے ہی قامت سے ژولیدہ دامن
 ہیں جو یا کسی عظمتِ نار سا کے---
 انہیں کیا خبر کیسا آ سیب برم مرے غار سینے پہ تھا
 جس نے مجھ سے [اور اس کو زہ گر سے] کہا:
 ”اے حسن کو زہ گر، جاگ
 در در سالت کا روز بشارت ترے جام و مینا
 کی تشنہ لبی تک پہنچنے لگا ہے“!
 یہی وہ ندا، جس کے پیچھے حسن نام کا
 یہ جواں کو زہ گر بھی
 پیاپے روائی ہے زماں سے زماں تک،
 خزاں سے خزاں تک!

جہاں زاد، میں نے --- حسن کو زہ گرنے ---
 بیا باں بیا باں یہ در در سالت سہا ہے
 ہزاروں برس بعد یہ لوگ
 ریزوں کو چنتے ہوئے
 جان سکتے ہیں کیے
 کہ میرے بگل و خاک کے رنگ دروغ ن
 ترے نازک اعضا کے رنگوں سے مل کر
 ابد کی صدابن گئے ہیں؟

کہاں سے پائے؟
 کس سے ایفا ہوئے اندوہ کے آداب کبھی
 آرزو میں کبھی پایا ب تو سریاب کبھی!

یہ کوزوں کے لائے، جوان کے لئے ہیں
 کسی داستانِ فنا کے وغیرہ وغیرہ۔۔۔
 ہماری اذال ہیں، ہماری طلب کا نشان ہیں
 یہ اپنے سکوتِ اجل میں بھی یہ کہہ رہے ہیں:
 ”وہ آنکھیں ہمیں ہیں جو اندر گھلی ہیں
 تمہیں دیکھتی ہیں، ہر اک درد کو بھانپتی ہیں
 ہر اک حسن کے راز کو جانتی ہیں
 کہ ہم ایک سنان جھرے کی اس رات کی آرزو ہیں
 جہاں ایک چہرہ، درختوں کی شاخوں کے مانند
 اک اور چہرے پہ جھک کر، ہر انسان کے سینے میں
 اک برگِ گل رکھ گیا تھا
 اُسی شب کا دزدیدہ بوسہ ہمیں ہیں!“



GCU
GC University, Lahore

شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، لاہور